تدبّر
لاہور

59

زیرِ نگرانی:

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

نئی اشاعت

امام حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ کی مندرجہ ذیل تالیف مطالعہ فرمایئے

حکمت قرآن

موضوعات :

امام فراہیؒ کا تصور حکمت
حکمت کی اصل اور اس کی فروع
حکمت اور قرآن حکیم
دین اسلام کا نظام
دین اسلام کی بنیادیں
حکمت کا مفہوم
حکمت کی تعلیم اور اس کا حصول
حکیم کا طرز فکر و تعلیم
مذاہب پر غور کا طریقہ

ترجمہ = خالد مسعود
قیمت = /75 روپے

فاران فاؤنڈیشن

122 - فیروز پور روڈ- اچھرہ' لاہور 54600
فون = 7595200

اسباق النحو

مصنف : خالد مسعود

- امام فراہیؒ کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم' فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمہ کے لیے مشقیں

"میرے نزدیک یہ کتاب طلبہ فن کے لیے کافی ہے- اس سے
عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی"_
مولانا امین احسن اصلاحی

قیمت : 36 روپے
شائع کردہ : ادارہ تدبر قرآن و حدیث مسلم کالونی رحمان سٹریٹ سمن آباد لاہور

زیرِ نگرانی :
مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر :
خالد مسعود

تدبر لاہور

شمارہ نمبر 59
جنوری 1998ء
رمضان المبارک 1418ھ

مجلسِ ادارت
عبداللہ غلام احمد
ماجد خاور
محبوب سبحانی
سعید احمد

قیمت : ۱۰/- روپے
سالانہ : ۴۰/- روپے
بیرون ملک : ۲۰۰/- روپے

فہرست

تذکرہ و تبصرہ		
علم و عرفان کے ماہِ کامل کا غروب	خالد مسعود	2
تدبر قرآن		
تفسیر سورہ نور	خالد مسعود	26
تدبر حدیث		
اسلامی آداب	امین احسن اصلاحی/ سعید احمد	39
مقالات		
مواخات اور میثاق مدینہ	خالد مسعود	53

ناشر : ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد لاہور

مطبع : المطبعۃ العربیۃ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

علم و عرفان کے ماہ کامل کا غروب

شعبان 1418ھ کی چودھویں کا چاند جب پوری آب و تاب سے آسمان پر اپنی رعنائی دکھا رہا تھا عین اس وقت علم و عرفان کا ماہ کامل غروب ہو رہا تھا۔ دور حاضر کے عظیم مفسر قرآن اور علوم قرآنی کے یکتا عارف مولانا امین احسن اصلاحی نے زندگی بھر اپنے رب سے مناجات کے لیے صبح تین بجے کا جو وقت مقرر کیے رکھا وہی وقت رب نے اپنے بندے کو اپنے پاس بلانے کے لیے پسند فرمایا۔ مولانا کی عمومی صحت 1993 کے آخر تک بہت اچھی رہی۔ اس کے بعد عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے۔ اس بیماری پر قابو پالیا گیا لیکن دو سال قبل مولانا پر فالج کا حملہ ہو گیا جس کے بعد ان کی بیماری پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی گئی۔ 1997 کے سال میں مرض میں اگرچہ اضافہ نہ ہوا' طبیعت یکساں رہی' لیکن نقاہت بڑھتی چلی گئی۔ اس کے باوجود مولانا نے صبر و سکون کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ وہ مہمانوں کو خوش آمدید کہتے۔ سہارے سے بیٹھ کر مجلس میں اپنی شمولیت کا اظہار کرتے۔ خاص اعزہ و اقارب' احباب اور شاگردوں کو پہچانتے' ان سے بات کرتے اور الوداع کہتے۔ راقم سطور اپریل 1997 میں حج سے واپسی پر ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ مصافحہ کر کے بیٹھنے لگا تو فوراً بغلگیر ہونے کے لیے بازو اٹھا دیے کہ حاجیوں سے ملنے کا دستور یہی ہے۔ نومبر میں غذا بے حد کم ہو گئی جس کے باعث نقاہت اتنی زیادہ ہو گئی کہ پہچاننے میں مشکل پیش آنے لگی۔ اپنا مدعا بھی زبان پر نہ لا سکتے۔ جسم تیزی سے گھلنے لگا۔ یہی نقاہت بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی اور مجسم علم و عرفان اور صبر و عزیمت کا یہ پہاڑ 15 دسمبر 1997 کو زمین میں اتر گیا جہاں ہر متنفس کو جانا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم کی زندگی کا مقصد وحید قرآن سیکھنا' اپنے کو اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا اور قرآن سکھانا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے عمر کے ستر سال تو بالکل مخصوص ہی کر دیے تھے۔ انہوں نے زندگی نہایت بھرپور گزاری' اس میں بڑے نشیب و فراز بھی آئے لیکن بقول شاعر

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مولانا نے اپنے مقصد حیات کو کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے: خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ (تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن خود سیکھے اور دوسروں کو سکھائے) مولانا مرحوم اس ارشاد کا کامل مصداق تھے۔ ان کی کتاب زندگی کا ہر ورق اس کا شاہد ہے۔

نسب و وطن :- مولانا امین احسن اصلاحی کے والد ماجد کا نام حافظ محمد مرتضیٰ ولد وزیر علی ہے۔ حافظ صاحب نے حج کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ وہ بھارت کے صوبہ یوپی کے ایک چھوٹے سے گاؤں بمہور ضلع اعظم گڑھ کے ایک متدین' نیک سیرت اور معزز فرد تھے جن کا تعلق ضلع کی راجپوت برادری سے تھا۔ یہ وہی برادری تھی جس سے مولانا شبلی نعمانی کو نسبت حاصل تھی۔ حافظ صاحب گاؤں کے ایک متوسط درجے کے زمیندار تھے۔ ان کے گھر میں دینی فضا تھی۔ نماز روزہ کا خاص اہتمام تھا۔ ان کے ہاں بیٹے کی ولادت 1904 میں ہوئی لیکن صحیح تاریخ محفوظ نہیں رہ سکی۔ خاندان کے بزرگوں' خصوصاً والد صاحب نے' بیٹے کی پرورش بڑی شفقت سے کی۔

تعلیم :- مولانا اصلاحی کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ وہیں دیکی مکتب میں لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ایک مولوی صاحب سے قرآن پڑھا' نیز فارسی کے کچھ سبق لیے۔ دس سال کی عمر ہوئی تو گاؤں کے ایک عالم مولانا شبلی متکلم کے مشورہ سے ان کو دینی و عصری تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ دلوایا گیا۔ یہ مدرسہ 1327 ہجری میں علاقہ کے ایک بزرگ مولانا محمد شفیع نے قائم کیا تھا۔ اسے چلانے کے لیے انجمن اصلاح المسلمین فعال تھی۔ ابتدا میں یہ مدرسہ معمولی نوعیت کا تھا۔ بعد میں مولانا شبلی نعمانی نے اس میں دلچسپی لی اور اس کے اغراض و مقاصد مرتب کیے۔ مولانا حمید الدین فراہی نے اس کے لیے نصاب تعلیم تجویز کیا اور نا تمام شعبوں کی تکمیل کی۔ یوں یہ مدرسہ ترقی کر گیا۔ اس میں دینی تعلیم جدید تصور کے مطابق دی جاتی تھی۔ قرآن مجید کی تعلیم کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ادب عربی پڑھانے کا خاص اہتمام تھا۔ فقہ کی تعلیم بغیر کسی گروہی تعصب کے دی جاتی تھی۔ کوشش کی جاتی کہ طالب علم جس فقہی مسلک کو کتاب و سنت سے زیادہ موافق پائیں اس کو اختیار کریں۔ ابتدائی درجہ تک انگریزی سے بھی متعارف کرایا جاتا تھا۔ مولانا اصلاحی چونکہ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کر چکے تھے اس لیے مدرسہ میں ان کو تیسرے درجہ میں داخلہ دیا گیا۔ ان کا یہاں قیام 1914ء سے 1922ء تک رہا جب انہوں نے سند فراغ حاصل کی۔ مدرسہ کے نام کی نسبت ہی سے اصلاحی کہلاتے تھے۔

مدرسہ میں متعدد اساتذہ سے پڑھا لیکن سب سے زیادہ جس شخصیت نے مولانا کو متاثر کیا اور ان کی علمی' ادبی اور تقریری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا وہ مولانا عبدالرحمن نگرامی تھے جو بے حد ذہین' لائق اور ہمہ صفت موصوف استاد تھے۔ مولانا بتایا کرتے تھے کہ میں نے جب مدرسہ میں داخلہ لیا تو پڑھنے کے معاملہ میں بد شوق سا تھا لیکن مولانا نگرامی کی محنت اور توجہ سے میرے اندر عام مطالعہ کے علاوہ عربی ادب کا شوق پیدا ہو گیا۔ ان کا فیض صحبت میری زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا باعث بنا۔ علم کلام میں مولانا کے

استاد مولانا شبلی کے شاگرد خاص مولانا شبلی متکلم ندوی تھے لیکن ان کے مضمون سے مولانا کو کبھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ ایک عاقل کے لیے وہ علم کلام کی افادیت کے قائل نہ تھے۔ ریاضی کے مضامین کو بھی مولانا ایک بوجھ ہی سمجھتے رہے۔ فرماتے تھے کہ اسی لیے میں میراث و فرائض کے مضامین میں کمزور رہا۔ تقریر میں مولانا کی صلاحیتیں خوب ابھریں اور طالبعلمی کے زمانہ ہی میں ان کی شہرت مدرسہ سے باہر علاقہ میں بھی پھیل گئی۔ مدرسہ میں مولانا محمد علی جوہر کی تقریر ہوئی تو ان کے سامنے طلبہ کی نمائندگی کرنے کے لیے مولانا اصلاحی سے تقریر کروائی گئی۔ مولانا جوہر نے اس تقریر کی بڑی داد دی اور مولانا فراہی نے اس پر خوش ہو کر حسن تقریر کے انعام کے طور پر اپنی کتابوں کا ایک سیٹ مولانا کو دیا۔

مدرسہ سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد بجنور سے شائع ہونے والے اخبار "مدینہ" کے مالک محمد مجید حسن نے مولانا کو اخبار میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ وہ ان کے لکھے ہوئے بعض مضامین کو دیکھ کر ان کی تحریری صلاحیت کے معترف ہوئے تھے۔ چنانچہ مولانا نے اخبار کے نائب مدیر کا کام سنبھالا۔ اس وقت مولانا کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ اسی لیے مولانا ابوالکلام نے ایک مرتبہ کہا کہ مدینہ اخبار کو نابالغ مدیر میسر آگیا ہے۔ اخبار مدینہ اس زمانہ میں یوپی کا سب سے اچھا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں وہ تحریک خلافت کا علمبردار اور سیاست میں کانگریس کا ہمنوا تھا۔ اخبار کے مالک مجید حسن نے بچوں کے ایک ہفت روزہ رسالہ "غنچہ" کی ادارت بھی مولانا کے سپرد کردی۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے اخبار "سچ" کے لیے بھی کام کیا جس کو مولانا عبدالماجد دریابادی نکالتے تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی" ریاست حیدر آباد میں نظام دکن کے قائم کردہ دارالعلوم عثمانیہ کے پرنسپل تھے اور اس وقت علم تفسیر میں نظم قرآن پر مبنی جدید منہاج تجویز کرنے کے باعث علمی و دینی حلقوں میں بڑی شہرت پا چکے تھے۔ 1925ء میں انہوں نے اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے وطن پھریہا ضلع اعظم گڑھ کو لوٹ آئے۔ مولانا اصلاحی کو ان کی آمد کا پتا چلا تو ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ انہوں نے احوال و مصروفیات معلوم کیں۔ پھر پوچھا: "کیا آپ اخبار نویسی ہی کریں گے یا ہم سے قرآن پڑھیں گے؟" مولانا نے بلاتوقف کہا: "اگر آپ قرآن مجید پڑھائیں تو میں حاضر ہوں"۔ مولانا قرآن فہمی میں ان کے مرتبہ و مقام سے آگاہ تھے لیکن اب تک ذاتی طور پر ان سے استفادہ کا موقع حاصل نہیں کرپائے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مولانا فراہی" کی اس پیشکش کو نعمت غیر مترقبہ اور ان کی شاگردی کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہوئے فوراً قبول کر لیا۔ مولانا فراہی نے اسی وقت طے کر دیا کہ آپ کا قیام و طعام میرے ساتھ رہے گا۔ معاملات کو سمیٹ کر جلد آجایئے۔ جب مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ کو علم ہوا کہ مولانا فراہی اصلاحی صاحب کو قرآن پڑھانے والے ہیں تو انہوں نے درخواست کی کہ یہ درس گھر کے بجائے مدرسہ میں ہو تاکہ وہ بھی اس میں شرکت کر سکیں۔ مولانا فراہی نے اس درخواست کو قبول کرلیا اور درس سرائے میر

میں ہونے لگا۔ مولانا فراہی جس عمارت میں قیام کرتے، اسی عمارت میں سامنے کا کمرہ مولانا اصلاحی کا تھا جو استاد کی ضروریات کا خیال رکھتے، ان کی خدمت کے لیے ہمہ وقت حاضر رہتے اور قرآن کے اسباق کی تیاری کرتے۔ یوں انہیں استاد گرامی سے فیض یاب ہونے کا موقع سب سے زیادہ ملا۔

مولانا اصلاحی کے ہم درس یوں تو مدرسہ الاصلاح کے کئی اساتذہ تھے لیکن حقیقی ساتھی مولانا اختر احسن تھے جو مدرسہ میں تعلیم کے دوران ان کے ہم جماعت رہے تھے اور اس وقت مدرسہ میں مدرس تھے۔ مولانا فراہی سے تلمذ کے زمانہ میں دونوں میں بے حد محبت پیدا ہو گئی۔ مولانا اعتراف کرتے تھے کہ اختر احسن صاحب نے میری علمی خامیوں کے دور کرنے میں نہایت فیاضی سے مدد کی۔ اس طرح وہ نہ صرف درس کے ساتھی بلکہ مولانا کے استاد بھی تھے۔ مولانا فراہی" کی توجہ ان دونوں پر رہی اور دونوں نے بھی بڑی محنت سے کسب فیض کیا۔ مولانا اصلاحی نے اس درس کو ہمیشہ سرمایہ حیات سمجھا اور ان دنوں کا تذکرہ بے حد شوق سے کیا کرتے۔ جونہی استاد گرامی کا ذکر ہوتا تو ان کی یادداشتوں کے دریچے وا ہو جاتے اور وہ بلاتکان اس زمانہ کے احوال سنایا کرتے۔

مولانا فراہی" کا یہ درس 1930ء کے اواخر تک رہا۔ نومبر 1930ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انتقال سے قبل متھرا کے ضلعی ہسپتال میں وہ مولانا اصلاحی کو یاد کرتے رہے۔ مولانا کو بلوایا گیا اور وہ ابھی کمرے کے باہر ہی تھے کہ استاد نے فرمایا: "امین آگیا۔" مولانا کو کمرے میں بلوایا گیا تو ان کو سینے سے لگا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی انتظار میں تھے کہ ان کے معتمد شاگرد آئیں تو اپنی علمی امانت ان کے حوالہ کرکے دنیا سے رخصت ہوں۔

مولانا فراہی" کی شاگردی میں مولانا نے ان سے علوم تفسیری نہیں پڑھے بلکہ استاد کے طریقہ تفسیر میں مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ عربی شاعری کی مشکلات کے حل میں ان سے مدد لی۔ سیاسیات میں ایک اہم کتاب بلنچلی کی تھیوری آف اسٹیٹ سبقاً سبقاً پڑھی اور فلسفہ کی بعض چیزیں مولانا فراہی کی نگرانی میں پڑھیں۔ اس دوران میں مولانا STOICS کے فلسفہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ بتایا کرتے تھے کہ میں مارکس آریلیس کی تحریریں پڑھ پڑھ کر رویا کرتا تھا۔ مولانا فراہی کو پتہ چلا تو انہوں نے اس کے فلسفہ پر ایک تقریر کی جس کے بعد میرے دل کو قرار آگیا۔

مولانا فراہی" جیسی نابغہ روزگار شخصیت سے کسب فیض کے بعد مولانا اصلاحی کی خواہش ہوئی کہ علم حدیث بھی کسی صاحب فن سے پڑھیں۔ اتفاق سے ان کے اپنے وطن ہی میں ایک قصبہ مبارک پور میں شیخ الحدیث، مولانا عبدالرحمٰن" مبارک پوری، جو حدیث میں نہایت عالی سند رکھتے تھے، علمی کام میں مصروف تھے۔ وہ صحاح ستہ کی مشہور کتاب جامع ترمذی کے استاد تھے اور ان دنوں اس کی شرح "تحفۃ الاحوذی" کے نام سے لکھ رہے تھے۔ مولانا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علم حدیث پڑھانے کی

درخواست کی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ نوجوان مدرسۃ الاصلاح کے فاضل اور مولانا فراہی کے شاگرد ہیں' انہوں نے رسمی طور پر ترمذی کی ایک حدیث پڑھا کر کتاب کے نسخہ پر مولانا کو اپنی جانب سے سند لکھ کر دے دی اور اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ مولانا نے استاد کا یہ تحفہ قبول کر لیا لیکن کہا کہ میں محدثین کرام کا یہ تاج محض اجازت حدیث لے کر اپنے سر پر سجانے کے لیے حاضر نہیں ہوا بلکہ علم حدیث کو بطور فن آپ سے سیکھنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ ترمذی شریف کے ماہر ہیں۔ مجھے باقاعدہ شاگردی میں لیجئے۔ مولانا مبارک پوری نے بخوشی اس کی اجازت دے دی۔ انہیں اصول حدیث میں نخبۃ الفکر پڑھائی' جامع ترمذی کا درس شروع کیا اور اپنی شرح کے لیے رجال حدیث کی تحقیق میں مولانا سے کام لینے لگے۔ اس طرح مولانا فن حدیث کے اصول' سند کی تحقیق' رجال کی جرح و تعدیل کے طریق کار' ہر چیز سے آشنا ہو گئے۔ بتایا کرتے تھے کہ مبارک پور میں مجھے جو محنت کرنی پڑی اس کو میں کبھی بھول نہیں سکا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ مجھے اپنے گاؤں سے مبارک پور تک پیدل آنا جانا پڑتا تھا۔ درس کی مقدار غیر معمولی تھی جس کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ مدت کے بعد اس قدر بیمار ہو گیا کہ افاقہ و صحت کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔

مولانا بیان کرتے تھے کہ جب کبھی متن حدیث کے بارے میں کوئی اشکال پیش کر کے میں استاد گرامی سے وضاحت چاہتا تو وہ فرمایا کرتے کہ اس کی سند دیکھو۔ میں کہتا کہ سند میں تو کوئی راوی کمزور نہیں تو فرماتے کہ پھر آگے بڑھو۔ کبھی مجھ سے عبارت پڑھنے میں غلطی ہو جاتی تو اصلاح کرتے اور فرماتے: کوئی بات نہیں' اصیل گھوڑا بھی کبھی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ مولانا مبارکپوری کے درس میں مولانا کو اندازہ ہوا کہ محدثین کرام اصل زور سند پر صرف کرتے ہیں' متن کی تحقیق ان کے ہاں بنیادی اہمیت نہیں رکھتی۔

مولانا نے فقہ کی تعلیم مدرسہ ہی میں حاصل کی۔ وہاں گروہی فقہ نہیں پڑھائی جاتی تھی بلکہ تمام مکاتیب فکر کی فقہ کو یکساں اہمیت دی جاتی تھی۔ بعد میں مولانا نے فقہ کا مطالعہ اپنے طور پر جاری رکھا اور امہات کتب پر ان کی نظر تھی۔ اصول میں وہ حنفی فقہ کو افضل مانتے تھے لیکن اپنی تربیت کی روشنی میں انہیں بعض مسائل میں احناف سے اختلاف بھی تھا۔

تدریس:- 1925ء میں مولانا اصلاحی جب سرائے میر آ گئے تو مدرسہ الاصلاح نے ان کو بطور مدرس تعینات کر لیا۔ مدرسہ میں وہ قرآن مجید' عربی ادب اور فلسفہ تاریخ کے مضامین پڑھاتے تھے۔ مدرسہ سے یہ وابستگی مولانا فراہی کے انتقال کے بعد بھی قائم رہی۔ یہ سلسلہ 1943ء میں منقطع ہوا۔

مدرسہ کے ساتھ سترہ سالہ وابستگی کے دوران مولانا نے مدرسہ کے لیے چندہ فراہم کرنے کی غرض سے ملایا کا دورہ کیا جہاں ان کے علاقہ کے بعض تاجر مقیم تھے۔ 1935ء میں اپنے استاد مولانا فراہی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی ترتیب و تہذیب اور اشاعت کے لیے مدرسہ میں "دائرہ حمیدیہ" کے نام سے ایک

ادارہ قائم کیا۔ اس کے زیر اہتمام ایک اردو ماہنامہ "الاصلاح" کے نام سے جاری کیا تاکہ استاد کے افکار سے اردو دان طبقہ کو بھی آشنا کیا جائے کیونکہ مولانا فراہی نے جو کچھ لکھا وہ عربی زبان میں تھا۔ مسودات کی ترتیب و تہذیب کا کام مولانا اختر احسن کرتے اور ان کا ترجمہ کرنا اور رسالہ کی ترتیب مولانا اصلاحی کے ذمہ ٹھہری۔ اس دوران میں مولانا فراہی کے بعض مسودات طبع ہو گئے۔

مولانا قرآن مجید پر برابر تدبر کرتے اور مختلف موضوعات پر تحقیق کرتے رہے۔ چنانچہ الاصلاح میں جہاں انہوں نے مولانا فراہی کی تفاسیر کے تراجم شائع کیے وہیں اپنی تحقیقات بھی شائع کیں جو بعد میں حقیقت توحید' حقیقت شرک' حقیقت تقویٰ اور توضیحات کے نام سے شائع ہوئیں۔ "مجموعہ تفاسیر فراہی" کے نام سے وہی تراجم یکجا شائع ہوئے جو پہلے الاصلاح میں چھپے تھے۔ ماہنامہ الاصلاح کی اشاعت 1939ء میں معطل ہو گئی۔ مبادی تدبر قرآن بھی مولانا کی اسی دور کی تصنیف ہے۔

جماعت اسلامی میں شمولیت:- جس زمانہ میں الاصلاح شائع ہو رہا تھا مولانا مودودی "کانگریس پر سخت تنقید اور متحدہ قومیت کے تصور کو غلط قرار دے رہے تھے۔ مولانا اصلاحی نے ایک مضمون میں لکھا کہ جہاں تک متحدہ قومیت کے غلط ہونے کا تعلق ہے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کے مقابل میں مسلم لیگ جو دعوت دے رہی ہے وہ یہ ہے کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔ اس جماعت کو لوگوں کے دین و ایمان' عقائد' اخلاق اور کردار سے کوئی بحث نہیں۔ اس کی دعوت کونوا عباداللہ اخوانا کی اسلامی دعوت نہیں ہے یعنی اللہ کے بندو' سب بھائی بھائی بن جاؤ۔ حالانکہ کرنے کا اصل کام یہ ہے اور انبیاء و صلحاء کی دعوت ہمیشہ یہی رہی ہے۔ لہٰذا مولانا مودودی اگر اسلام کے لیے بیداری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں لوگوں کو اسلام پر مجتمع ہونے کی دعوت دینی چاہیے۔ مولانا مودودی نے اس موقف کو صحیح تسلیم کیا اور ان کے مضامین میں تبدیلی آ گئی۔ بعد میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ مدرسہ الاصلاح میں مولانا سے ملے اور دریافت کیا کہ اگر کونوا عباد اللہ اخوانا کی بنیاد پر کوئی جماعت قائم کی جائے تو کیا مولانا اس میں شمولیت اختیار کر لیں گے۔ مولانا نے جواب دیا کہ مدرسہ میں میری ذمہ داریاں بے حد اہم ہیں اور مجھے مولانا فراہی کے ناتمام کاموں کی تکمیل کرنی ہے' لہٰذا میں کسی دوسرے کام میں شریک تو نہیں ہو سکتا البتہ میں ایسے کام کو مبارک سمجھتا ہوں۔ یہ کام ہونا چاہیے۔ مولانا نعمانیؒ نے باصرار کہا کہ ایک ملاقات مولانا مودودی سے ضرور کریں کیونکہ وہ ایک جماعت کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔ یہ ملاقات لاہور میں ہوئی۔ ملاقات کے بعد مولانا نعمانی نے پوچھا کہ آپ نے مولانا مودودی کو کیسا پایا۔ مولانا نے جواب دیا' مولانا ان کا قصہ چھوڑیے۔ بس ایک اچھے انشاپرداز ہیں۔ مولانا نعمانی نے کہا دیکھو' اب شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے پایہ کے لوگ نہیں ملیں گے۔ اب تو کام چلاؤ آدمی چاہیے۔ اس لیے اگر ایک شخص اس نیک کام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے تو ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ مولانا اصلاحی نے کہا آپ حضرات

ساتھ دیجیے اور کام کیجیے۔ میں کب کہتا ہوں کہ اگر شاہ صاحب اور سید صاحب جیسے لوگ نہ ملیں تو کام ہی نہ ہو۔

1941ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی۔ جب تاسیس میں شامل ارکان کے نام شائع ہوئے تو ان میں مولانا اصلاحی کا نام بھی تھا' حالانکہ وہ تاسیسی اجلاس میں شریک نہ ہوئے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے تردید چھاپنے کا ارادہ کیا تو مولانا اصلاحی نے اسے مروت کے خلاف سمجھا اور مولانا ندوی سے کہا کہ آپ کاہے کو تردید کرتے ہیں۔ کوئی دینی کام ہی ہو گا۔ غیر دینی کام تو نہیں ہو گا۔ اس طرح مولانا نعمانی کے اعتماد کو انہوں نے ٹھیس نہ پہنچائی جنہوں نے اپنے اعتماد پر ان کا نام شائع کروا دیا تھا۔

جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر دارالاسلام پٹھانکوٹ میں قائم ہوا تو جماعت کے کاموں میں معاونت کے لیے مولانا مودودی کی نظر انتخاب مولانا اصلاحی پر پڑی۔ انہوں نے تقاضا شروع کیا کہ مرکز کی تمام ذمہ داریاں ان کے لیے تنہا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اس لیے مولانا دارالاسلام منتقل ہو جائیں۔ مولانا سرائے میر میں اپنی ذمہ داریوں کے حوالہ سے لیت و لعل سے کام لیتے رہے لیکن یہ تقاضا بھی بڑھتا چلا گیا۔ ادھر مدرسہ کے احوال میں بھی تبدیلی آئی اور مولانا کو بعض لوگوں کی رقابت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے استخارہ کے ساتھ ساتھ دیوان حافظ سے فال لی تو یہ شعر نکلا۔

معرفت نیست دریں قوم خدایا مددے
تابرم گوہر خود را بہ خریدار دگر

(ان لوگوں میں پہچان نہیں ہے۔ الٰہی مدد کر کہ میں اپنا گہر دوسرے خریدار کے سامنے پیش کروں)

چنانچہ مولانا 1943ء میں دارالاسلام منتقل ہو گئے اور بعد ازاں نائب امیر کی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ اب ان کا اوڑھنا بچھونا اگرچہ جماعت تھی لیکن قرآن مجید پر غور و فکر ان کی تمام سرگرمیوں کا محور تھا۔ خاص اوقات اس کے لیے وقف تھے۔ جماعتی ضرورتوں کے لیے رہنمائی بھی قرآن مجید سے اخذ کرتے تھے۔ "دعوت دین اور اس کا طریق کار" ان کی ایسی ہی تصنیف ہے۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان میں اور مولانا مودودی میں قدر مشترک یہ بات تھی کہ دونوں تقلید و جمود سے آزاد تھے۔ دینی معاملات پر ایک ہی طرح سوچتے تھے' ان امور میں کوئی اختلاف نہیں تھا کہ قرآن' حدیث اور فقہ پر کیسے غور کرنا چاہیے' علماء کو دعوت کس طرح دی جائے اور لوگوں کے ذہنوں میں تبدیلی کیسے لائی جائے۔ دونوں میں اختلاف ذوق اور فکر کا تھا۔ مولانا فراہی" کے فکر سے مولانا مودودی کو نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ یہ ان کے بس کا کام تھا۔ جبکہ مولانا اصلاحی دل و جان سے اس کے گرویدہ اور صحیح فہم دین میں اس کو فی الواقع مشعل راہ بنائے ہوئے تھے۔

جماعت کے قیام کے کچھ عرصہ بعد مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کو امیر جماعت

کی شخصیت اور ان کے معیار تقویٰ سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ جماعت کے مقاصد کے لحاظ سے جماعت کے سربراہ کو نہایت عبادت گزار اور متقی ہونا چاہیے تاکہ اس کی ذات سے سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جائے۔ مولانا مودودی ان کے معیار تقویٰ پر پورے نہیں اترتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جماعت سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اس موقع پر مولانا اصلاحی کو بھی اعتماد میں لیا۔ انہیں توقع تھی کہ مولانا بھی انہی کی طرح فیصلہ کریں گے لیکن مولانا کا جواب یہ تھا کہ آپ حضرات تقویٰ اور عزیمت کے جس مقام پر ہیں آپ کا امیر جماعت کی شخصیت پر اطمینان نہ ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن میں تو مولانا مودودی سے بھی گیا گزرا ہوں' لہٰذا میں اس چیز کو جماعت سے علیحدگی کی بنیاد نہیں بنا سکتا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو مولانا کے اونچے ظرف کی غماز تھی۔ اس میں عجز و انکساری بھی تھی اور وابستگان جماعت کے لیے ایک سبق بھی۔ بعد ازاں جب مولانا نعمانی نے جماعت اسلامی کے خلاف لکھا تو مولانا ہی نے اپنے اس عزیز دوست کے خلاف مورچہ لگایا۔ جماعت کے لیے ان کی فدویت کا یہ عالم رہا کہ جدھر سے بھی جماعت کو نشانہ بنایا گیا' مولانا دفاع کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ ان کے تمام تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تنقیدات" کے نام سے شائع ہوا۔

1947ء میں جماعت اسلامی کے اکابر دارالاسلام سے پہلے راولپنڈی اور پھر لاہور منتقل ہوئے اور وہیں جماعت کے مرکزی دفاتر قائم ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی کی سوچ میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلم لیگ کی ذمہ داری پاکستان بنانا تھا۔ اس کو چلانے کی اہلیت اس کے پاس نہیں ہے اور ایک اسلامی ریاست کے چلانے کے لیے مطلوبہ صفات کے حامل افراد جماعت اسلامی کے پاس ہیں۔ لہٰذا اب اقتدار جماعت کو ملنا چاہیے۔ پاکستان کے عوام دل و جان سے اسلام کے نفاذ کے خواہشمند ہیں' لہٰذا جماعت کے برسراقتدار آنے میں اب کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ جماعت کے محرم راز لوگوں کا بیان ہے کہ پاکستان میں ہونے والے پہلے الیکشن سے قبل کارکنان جماعت یہ تک سوچتے تھے کہ جماعت اسلامی کی حکومت میں کون شخص کس وزارت پر فائز ہونے کا اہل ہے۔ مولانا اصلاحی انتخابی سیاست کو قبل از وقت اور جماعت کے حق میں غیر مفید قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ اقدام اس مقصد کے لیے سخت مضر ہو گا جس کے لیے جماعت قائم ہوئی۔ 1951ء میں جماعت نے پنجاب کے الیکشن میں حصہ لیا اور مولانا کو بھی ایک حلقہ سے بطور امیدوار کھڑا کیا لیکن نتیجہ سامنے آیا تو جماعت اپنی مہم میں بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی مولانا نے ایک علمی منصوبہ پر کام کیا کہ ایک اسلامی ریاست کیا ہوتی ہے' اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں' حکومت کے کارکنوں اور عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں' اس میں شہریوں کو کون سے حقوق حاصل ہوتے ہیں' غیر مسلموں کو کیسے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ مولانا کے

یہ مضامین پہلے پمفلٹوں کی صورت میں اور پھر کتاب "اسلامی ریاست" کی شکل میں شائع ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ہال میں اسلامی دنیا کے علماء کا اسلامک کلوکیم منعقد ہوا تو اس میں مولانا نے اسی موضوع پر عربی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ پاکستان قائم ہونے کے جلد بعد حکومتی سرپرستی کے تحت ایسے ادارے قائم ہونے لگے جو عورتوں کی آزادی اور ملک میں ثقافتی تبدیلی کے علمبردار تھے۔ مولانا نے ان کی سرگرمیوں کو خلاف شریعت اور معاشرہ کے لیے تباہ کن سمجھا' اور ان کے نتائج و عواقب کو واضح کرنے کے لیے "قرآن میں پردہ کے احکام" "پاکستانی عورت دوراہے پر" اور "اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام" کے نام سے کتابیں لکھیں اور اس طرح اپنی دینی ذمہ داری پوری کی۔ غیر اسلامی قانون سازی ہوئی تو اس پر تبصرے کر کے دینی موقف کو واضح کیا۔ کراچی کے لاء کالج میں تقاریر کے ایک سلسلہ میں اسلامی قانون کی مختلف اطراف کو واضح کیا۔ یہ تقاریر "اسلامی قانون کی تدوین" کے نام کی کتاب میں شامل ہیں۔

1953ء میں قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریک میں مولانا اصلاحی گرفتار ہو کر ڈیڑھ سال کے لیے جیل میں بند کر دیے گئے۔ قید کے دوران میں انہیں جماعت کی منصبی ذمہ داریوں سے فراغت نصیب ہوئی تو انہوں نے اپنے تیس سالہ قرآنی فکر کو مجتمع کیا۔ قرآن کی سورتوں کے مضامین کا تجزیہ کر کے آیات کو پیراگراف کی صورت میں تقسیم کیا اور ہر سورہ کا عمود یا مرکزی مضمون متعین کیا۔ حقیقت میں اسیری کے انہی ایام میں ان کی عظیم تفسیر تدبر قرآن پر اساسی کام ہوا۔

جماعت اسلامی میں مولانا اصلاحی نائب امیر جماعت رہے' نیز مرکزی شوریٰ میں ہمیشہ شامل رہے۔ مولانا مودودی کی غیر حاضری میں امیر جماعت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا بھی انہیں موقع ملا۔

جماعت اسلامی سے علیحدگی:- قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی نے ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی سالوں میں جو امور سامنے آئے وہ اصولی اور دستوری قسم کے تھے جن میں حصہ لینے میں کوئی قباحت نہ تھی لیکن انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر مولانا اصلاحی کی رائے الگ تھی۔ وہ اسے جماعت کے لیے سخت مضر سمجھتے تھے۔ جماعت ان کے نقطہ نظر کی قائل نہ ہو سکی۔ پنجاب کے الیکشن کے نتائج سامنے آئے تو جماعت میں بحران پیدا ہو گیا۔ کارکنوں میں مایوسی پیدا ہوئی اور قیادت کے خلاف جذبات پیدا ہونے لگے۔ جب شکوے شکایتیں زیادہ بڑھ گئیں تو 1956ء میں جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے تحقیقات کے لیے ایک جائزہ کمیٹی تشکیل دی۔ اس کے سربراہ حکیم عبدالرحیم اشرف اور ارکان میں مولانا عبدالجبار غازی' مولانا عبدالغفار حسن اور حکیم شیخ سلطان احمد تھے۔ اس کمیٹی نے پورے ملک کا دورہ اور ارکان جماعت سے ملاقاتیں کر کے دسمبر 1956ء میں مجلس شوریٰ کے اجلاس میں رپورٹ پیش کی۔ شوریٰ نے کمیٹی کی کارکردگی کو سراہا اور ایک قرارداد منظور کی جس کی ایک اہم شق یہ تھی کہ جماعت انتخابات کی سرگرمیوں سے فی الحال صرف نظر کر کے معاشرہ کی اصلاح پر زور دے گی۔ جائزہ کمیٹی کی

رپورٹ جماعت کے اندر بعض ایسے امور کو منکشف کرنے کا باعث ہوئی کہ مولانا مودودی نے اسے اپنے خلاف چارج شیٹ قرار دے دیا۔ ان کا احساس تھا کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان نے ان کے خلاف ایک سازش کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے شوریٰ کی قرارداد پر برہمی کا اظہار کیا اور جائزہ کمیٹی کے ارکان پر جتھہ بندی اور بلاک سازی کا الزام عائد کر کے ان سے استعفے طلب کر لیے۔ مولانا اصلاحی کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے امیر جماعت کے نام ایک خط تحریر کیا جس میں ان کے اقدام کو دینی' اخلاقی' دستوری ہر لحاظ سے غلط قرار دیا۔ اس پر مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کی امارت سے استعفیٰ دے دیا اور دوبارہ یہ ذمہ داری قبول کرنے پر صرف اس صورت میں آمادگی ظاہر کی کہ ارکان جماعت کا اجتماع ان کی پالیسیوں کی تائید کرے' نیز دستور جماعت میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ امیر جماعت اپنی پالیسیوں کو بغیر کسی رکاوٹ کے عملی جامہ پہنا سکے۔ 1957ء میں ماچھی گوٹھ ضلع رحیم یار خان کے مقام پر جماعت کا یہ اجتماع منعقد ہوا اور دستور میں ترامیم کر کے امیر جماعت کو ہمہ مقتدر بنا دیا گیا۔ اس میں مجلس شوریٰ کی حیثیت کمزور کر دی گئی۔ مولانا اصلاحی نے اجتماع میں ان تمام کوششوں کا توڑ کرنے کی کاوش اور ایک مفصل خطاب کیا لیکن جماعت نے ان کی اس نہایت اہم تقریر کو محفوظ نہیں کیا۔ نئی صورت حال میں مولانا اصلاحی نے جماعت اسلامی سے استعفیٰ دینے کا ارادہ کر لیا۔ جماعت کے کئی بہی خواہوں نے استعفیٰ رکوانے کی بڑی کوششیں کیں۔ انہوں نے اس معاملہ میں مصالحت کرانی چاہی' شام کے سفیر عمر بہاء الامیری تک نے اپنا کردار ادا کیا' ایک پنچایت بھی قائم ہوئی لیکن اس تمام تگ و دو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا' آخر کار جنوری 1958ء میں مولانا جماعت سے حتمی طور پر علیحدہ ہو گئے۔

جماعت سے علیحدگی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اصلاحی بیان کرتے تھے کہ مولانا مودودی اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیت۔۔۔ شورائیت۔۔۔ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اپنی آمریت قائم کرنے کے لیے انہوں نے دستور اور نظام جماعت کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ جائزہ کمیٹی کے خلاف غیر اخلاقی اور غیر دستوری اقدام سے انہوں نے جماعت میں بحران پیدا کر دیا اور جب اس کے خلاف آواز بلند کی گئی تو انہوں نے معترضین کی کردار کشی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی پیش کر دیا کہ نظریاتی حکمت اور ہوتی ہے' عملی حکمت اور۔ اسلام میں امیر کو دیکھنا پڑتا ہے کہ دین کے نفاذ میں اسے کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہے۔ اس کے لیے وہ بعض اصولوں کو ضرورت پڑنے پر قربان بھی کر سکتا ہے۔ "ان تجربات سے گزرنے کے بعد میں کس مقصد کے لیے جماعت میں پڑا رہتا؟ میں نہ تو انقلاب قیادت کے نعرہ کو اسلامی انقلاب کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور نہ ووٹ حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ کو اصلاح معاشرہ کا واسطہ۔ جماعت کا موجودہ دستور میرے نزدیک نہ شورائی ہے نہ جمہوری۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے امیر جماعت کے نہ عدل پر بھروسہ ہے' نہ ان کی تنہا بصیرت پر' نہ دستور جماعت کے ساتھ ان کی وفاداری پر۔ لے

دے کے صرف ایک چیز رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس جماعت میں بہت سے نیک دل اور خدا ترس مسلمان شامل ہیں۔ جماعت کی یہ چیز میری نگاہوں میں بڑی قابل قدر ہے۔ میں ان سب بھائیوں سے محبت کرتا اور ان کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں لیکن اس محبت اور دعاگوئی کے لیے میرا جماعت کے ساتھ بندھے رہنا کوئی ضروری نہیں تھا۔ یہ خدمت میں باہر رہ کر بھی انجام دیتا رہوں گا۔" مولانا کے نزدیک نئے دستور کے تحت جماعت پیری مریدی کا ایک نظام تھا یا پھر ایک آمر کی آمریت۔ ان دونوں چیزوں سے مولانا کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لٰہذا جماعت سے سترہ سالہ رفاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ مولانا کے استعفا پر مولانا مودودی ان کے پاس آئے اور استعفا واپس لینے کے لیے گفتگو کی۔ مولانا نے جواب دیا کہ مولانا" میں نے آپ کو پہچان لیا اور آپ نے مجھے پہچان لیا۔ اب ہماری راہیں جدا ہو چکی ہیں۔ آئندہ ہم کبھی نہ ملیں گے۔

خدمت دین کے پروگرام:۔ جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد مولانا نے اپنی ان ذمہ داریوں پر خصوصی توجہ دی جو قرآن مجید کے حوالہ سے ان پر عائد ہوتی تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے تفسیر لکھنے کا باقاعدہ آغاز کر دیا اور اس کی اقساط لائل پور سے شائع ہونے والے رسالہ المنبر میں شائع ہونے لگیں۔ اس سال مولانا حج پر گئے اور اپنے مشاہدات حج ایک سفرنامہ کی صورت میں مرتب کیے۔ اس کی اقساط بھی اسی رسالہ میں شائع ہوتی رہیں۔ بعد ازاں مولانا نے اپنا ذاتی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نام انہوں نے "میثاق" رکھا۔ جون 1959ء سے اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ اب مولانا کی تمام تحقیقات اس رسالہ میں شائع ہونے لگیں۔ ابتدائی چند پرچوں میں مولانا نے مولانا مودودی کے نظریہ حکمت عملی کے تار و پود بکھیرنے کے لیے ایک سلسلہ مضامین لکھا جو ان کی کتاب "مقالات اصلاحی" میں شامل ہے۔

جنوری 1958ء میں راقم سطور اپنے دوست جناب محبوب سبحانی کی معیت میں مولانا کے در دولت پر حاضر ہوا اور درخواست کی کہ وہ اپنے اوقات میں سے کچھ فارغ وقت قرآن مجید پڑھانے پر صرف کریں۔ مولانا نے ہم دونوں کو روزانہ بعد از نماز عصر آنے کی ہدایت کی۔ ہم قرآن مجید لے کر ان کے پاس پہنچتے لیکن مغرب تک کا سارا وقت ادھر ادھر کی باتوں میں گزر جاتا اور درس کی نوبت نہ آتی۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ تک یہی کیفیت رہی۔ آخر کار ایک دن مولانا فرمانے لگے تم لوگ بڑے سخت جان ہو۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ یہ نوجوان یونہی پڑھنے کی امنگ لے کر آئے ہیں' چند روز میں جوش ختم ہو جائے گا۔ میرا پہلا تجربہ لوگوں کے ساتھ یہی تھا لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ پڑھنے میں سنجیدہ ہیں' لٰہذا کام شروع کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مولانا باقاعدہ توجہ فرمانے لگے۔ 1959ء میں انہوں نے رسالہ میثاق جاری کیا تو اس میں راقم حتی المقدور ہاتھ بٹانے لگا۔ تین سال بعد مولانا نے محسوس کیا کہ ان کی معمولی توجہ سے بھی اسے بہت فائدہ ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہدایت فرمائی کہ دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دے کر درس کو باقاعدہ حلقہ کی شکل دی جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ عصر تا عشاء کا وقت تدریس کے لیے وقف کرنے کو

تیار ہیں۔ اس دعوت پر اٹھارہ بیس نوجوان تیار ہو گئے اور 1961ء میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا نے کمال دل جمعی اور محنت سے عربی گرامر' عربی ادب کی بعض کتابیں اور صحیح مسلم پڑھائی اور قرآن مجید کا مکمل درس دیا۔ یہ سلسلہ 1965ء تک جاری رہا جب ان کے صاحبزادے ابو صالح ہوائی جہاز کے حادثہ میں انتقال کر گئے اور ان کی تمام ذمہ داری مولانا کے ناتواں کندھوں پر آ گئی۔ اس حادثہ نے رسالہ میثاق اور حلقہ تدبر قرآن دونوں کا کام ٹھپ کر دیا۔

1966ء میں مولانا نے رسالہ کی ادارت جماعت اسلامی کے ایک سابق ساتھی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے حوالہ کی جو ان دنوں لاہور منتقل ہوئے تھے اور اپنے لیے ایک رسالہ کا ڈیکلریشن حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔

جماعت اسلامی سے اختلاف کر کے علیحدہ ہونے والے تنہا مولانا اصلاحی نہیں تھے بلکہ اجتماع ارکان کے بعد تقریباً ستر ارکان نے جماعت چھوڑ دی تھی۔ مولانا کے احباب اور جماعت کے دور کے ساتھیوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان تمام افراد کو مجتمع کریں اور ایک نئی جماعت کا نظم قائم کریں۔ مولانا کا خیال یہ تھا کہ تمام لوگ چونکہ کسی ایک نکتہ پر متفق ہو کر جماعت سے الگ نہیں ہوئے اس لیے ان کو جمع کرنا مینڈکوں کی ایک پنسیری باندھنے کے مترادف ہو گا اور وہ کوئی کام نہیں کر پائیں گے۔ تاہم مولانا نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ایسے سابق ارکان سے فرداً فرداً رابطہ کیا جائے۔ اگر ان کے اندر ذہنی ہم آہنگی اور کسی پروگرام پر اتفاق پایا جائے تو نظم قائم کرنے کا اقدام کیا جائے۔ مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحبان نے ملک کا دورہ کر کے سابق ارکان سے ملاقاتیں کیں اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان لوگوں کی جماعت سے الگ ہونے کی وجوہ مختلف تھیں اور ہر شخص جماعت اسلامی میں خرابی کی نشان دہی اپنے تجربہ کی روشنی میں ذاتی رائے کے مطابق کر رہا تھا۔ ان میں قدر مشترک صرف یہی تھی کہ یہ سب جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے۔ یہ لوگ کسی متعین ہدف پر بھی متفق نہیں تھے۔ اس صورت حال میں یہ فیصلہ ہوا کہ فوری طور پر جماعتی نظم قائم کرنا لاحاصل ہو گا۔ البتہ جتنے لوگ ہم خیال نظر آتے ہیں ان کا اجتماع منعقد کر کے ایک مجلس مشاورت قائم کر دی جائے۔ اگر مزید کچھ لوگ اس کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ پائے جائیں تو ان کو بھی فی الحال مجلس مشاورت ہی میں شریک کیا جائے۔ اس مجلس کا ایک اجتماع 6 تا 9 ستمبر 1967ء رحیم یار خان میں منعقد ہوا جس میں آئندہ کام کے لیے ایک قرارداد منظور کی گئی اور ایک ہیئت اجتماعی کی تشکیل کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایک مجلس مشاورت کا تقرر ہوا۔ اس مجلس میں سات ارکان تھے.... مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالغفار حسن' مولانا عبدالحق جامعی' سردار محمد اجمل خان لغاری' ڈاکٹر محمد نذیر مسلم' ڈاکٹر اسرار احمد اور شیخ سلطان احمد (معتمد) لیکن افسوس کہ باقاعدہ تنظیم قائم نہ ہو سکی۔ البتہ مجلس کے فیصلوں کی روشنی میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے مکان پر ایک نشست ہفتہ

وار درس قرآن کی شروع کی جس میں مولانا اصلاحی نے انتیسویں پارہ اور کچھ تیسویں پارہ کا درس دیا۔ بعد میں مولانا کو ڈاکٹر صاحب کے فکر سے اختلاف اور ان کے رویوں سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئیں۔

نسیان کی بیماری کا حملہ:- 1971ء کے آخر میں جب مولانا سورہ بنی اسرائیل تک تفسیر مکمل کر چکے تھے ان کو دوران سر اور نسیان کی بیماری نے آلیا۔ اس کی شدت اس قدر تھی کہ مولانا کو اشیاء اور افراد کی پہچان بھی نہ رہی۔ لکھنے لکھانے کا تمام کام ٹھپ ہو گیا۔ تفسیر کے شائقین اس کی تکمیل سے مایوس ہو گئے۔ لاہور کے تمام اہم ڈاکٹروں کے علاج سے مولانا کو کوئی افاقہ نہ ہوا اور بیماری تھی کہ روز بروز پہلے کی نسبت شدت اختیار کر رہی تھی۔ مولانا کے کئی عقیدت مندوں نے ان کی صحت کے لیے دعائیں کیں اور منتیں مانگیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ کراچی کے نامور دماغی معالج ڈاکٹر جمعہ سے علاج کرایا جائے۔ اس وقت مولانا کے ہم زلف چوہدری اقبال صاحب فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ انہوں نے پیشکش کی کہ وہ مولانا کا علاج کروائیں گے اور مولانا کا قیام کراچی میں انہی کی قیام گاہ پر ہو گا۔ ڈاکٹر جمعہ کی تشخیص کے مطابق بہت زیادہ دماغی محنت نے دماغ کی شریانوں کو سخت کر دیا تھا لہٰذا خون کی گردش میں دشواری کے باعث نسیان کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کے تجویز کردہ علاج سے اللہ تعالیٰ نے چند ہفتوں میں بیماری سے خلاصی دے دی۔ الفاظ کی یادداشت بحال ہو گئی' جملوں میں ربط پیدا ہو گیا اور پہچان لوٹ آئی۔ طبیعت بحال ہوتے ہی راقم سطور کو یاد کیا اور اپنی صحت کے بارے میں خط لکھوایا۔ مولانا کی بیماری میں تشویش کا ایک پہلو یہ تھا کہ مولانا صحت یاب ہونے پر اپنے سرمایہ علمی کو بھول نہ چکے ہوں۔ چنانچہ جوں ہی یادداشت لوٹ آنے کے آثار نظر آئے تو کراچی میں مولانا کے دوست شیخ سلطان احمد صاحب نے مولانا سے درس کی فرمائش کی۔ مولانا نے سورہ حدید کا درس دیا تو فرط مسرت میں شیخ صاحب نے راقم کو خوشخبری لکھ بھیجی کہ مولانا کی بیماری نے ان کے علم کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور درس حسب سابق بہت مدلل اور موثر تھا۔ مئی 1972ء میں مولانا لاہور واپس آئے۔ اب وہ خاصے صحت یاب ہو چکے تھے۔ راقم ملنے گیا تو فرمایا کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت عقل ہے۔ اسی کے باعث انسان اشرف المخلوقات ٹھہرا۔ اس بیماری میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان اپنی جس صلاحیت پر ناز کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ پلک جھپکنے میں اس کو سلب کر سکتا ہے۔ میری بیماری نے میرے اوپر بعض حقائق منکشف کیے ہیں۔ اگر میں اس تجربہ سے نہ گزرتا تو ان کے بارے میں اتنا پختہ یقین نہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً یہ مسئلہ کھلا کہ قرآن پر گہری نظر سے وہ صحیح ایمان پیدا ہوتا ہے جو مصائب میں سہارا بنتا اور مشکلات میں پریشانی سے بچاتا ہے۔ اگر ایک آزمائش سے گزر کر آدمی کچھ ایسی باتیں سمجھ لے جو بڑھاپے میں سہارا دینے والی ہوں تو یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔

بیماری سے اٹھ کر مولانا نے کئی ماہ بعد جمعہ کی نماز 9 جون 1972ء کو پڑھی تو اس پر بے حد مسرور

تھے۔ فرمانے لگے کہ اگرچہ مجھے یہ تسلی تھی کہ میں بیماری کے باعث نماز جمعہ کی حاضری سے معذور ہوں لیکن مجھے اس حدیث کے باعث وحشت ہوتی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لگاتار جمعہ کی تین نمازوں میں حاضر نہ ہو تو خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ یہودی ہو کر مرتا ہے یا نصرانی ہو کر۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ میں کئی ماہ گزر جانے کے باوجود ابھی اس پر قادر نہیں ہو رہا ہوں۔

ماہ جون میں مولانا کام کرنے کے قابل ہو گئے۔ فرمانے لگے کہ اب میری صحت اچھی ہو رہی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کام کی شکل کیا ہو گی اور تفسیر کیسے لکھی جائے گی۔ راقم نے مشورہ دیا کہ آپ سورہ کہف اور اس کے بعد کی سورتوں کو زیر مطالعہ رکھیں۔ حلقہ تدبر قرآن کے ساتھی بھی ان کو پڑھتے رہا کریں اور فی الحال ان کی مشکلات کے بارے میں آپ سے سوالات کریں۔ جب صحت مزید بہتر ہو جائے تب آپ لکھنا شروع کریں۔ مولانا نے اس مشورہ پر عمل کیا اور علمی مجالس منعقد ہونے لگیں۔ 9 جولائی سے مولانا نے سورہ کہف کا درس باقاعدہ دینا شروع کیا اور اس کے لیے ہفتہ میں دو دن مخصوص کیے۔ چند ہفتوں میں انہوں نے محسوس کیا کہ اب وہ تفسیر لکھ سکتے ہیں بشرطیکہ حلقہ کے رفقاء بھی اس کام میں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ راقم سطور' غلام احمد صاحب اور محمود احمد لودھی صاحب نے معاونت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس طرح تفسیر کی تحریر و تسوید کا کام پھر سے شروع ہو گیا۔

دیہات میں قیام:- مولانا کی معاشی حالت مستحکم نہیں تھی۔ وہ معاش کو اہمیت دینے کے بالکل قائل نہ تھے۔ قرآن مجید کی تعلیم کی روشنی میں ان کا ایمان اس بات پر تھا کہ آدمی کو فکر صرف اپنا فرض ادا کرنے کی ہونی چاہیے۔ اگر وہ اخلاص کے ساتھ اس میں منہمک ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس کی کفالت کی ایسی راہیں خود کھول دے گا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوں گی۔ اگر اس راہ میں کچھ آزمائشیں پیش آتی ہیں تو ان کا مقصد انسان کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔

مولانا کی اہلیہ محترمہ جالندھر کے قریب ایک گاؤں راہوں کے ایک بڑے زمیندار چوہدری عبدالرحمن کی صاحبزادی تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد غیر منقولہ جائداد کے بدلے میں پاکستان میں چوہدری صاحب کو مختلف مقامات پر زمین الاٹ کی گئی۔ مولانا کی گزر اوقات اس زمین کی پیداوار سے ہوتی تھی جو بیگم صاحبہ کے حصہ میں آئی۔ لیکن یہ آمدنی اخراجات کے مقابل میں ناکافی تھی۔ مولانا کے ایک عزیز دوست سردار محمد اجمل خان لغاری نے بیگم صاحبہ کے حصہ کی زمین اشتمال اراضی کے ذریعہ سے یکجا کروا دی تو اس کا انتظام ممکن ہو گیا۔ ابتدا میں زمین پر کاشت منشی کی زیر نگرانی ہوتی لیکن پیداوار پر ذاتی توجہ نہ دینے کے باعث یافت کم رہتی۔ مولانا کی بیماری کے اخراجات نے انہیں خاصا مقروض کر دیا تھا۔ صحت یابی کے بعد گھر میں اس مسئلہ پر غور ہوا کہ رقبہ پر رہائش کیوں نہ اختیار کر لی جائے تاکہ شہری اخراجات سے

جان چھوٹ جائے۔ دو وجوہ ایسی تھیں جو مولانا کو زمین پر منتقل ہونے سے روکتی تھیں۔ ایک یہ کہ لاہور میں قرآن کی تدریس کا کام اس صورت میں بالکل معطل ہو جاتا تھا۔ دوسری یہ کہ مولانا بیگم صاحبہ کی زمین ہی پر انحصار کر کے اپنی ذمہ داری بیگم صاحبہ کو منتقل کرنے والے کہلاتے۔ مولانا اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے بارے میں متامل ہو گئے۔ انہوں نے شیخ سلطان احمد صاحب سے رائے طلب کی تو انہوں نے کہا کہ یہ ہے تو آپ کا ایک ذاتی اور خانگی معاملہ جس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ دوسرا گاؤں جانے میں آپ کو تامل کیوں ہے؟ مولانا کا موقف تھا کہ اس طرح میں نان نفقہ کی ذمہ داری اپنی اہلیہ پر ڈالنے والا بن جاؤں گا۔ شیخ صاحب نے دلیل دی کہ آپ وہاں فارغ تو نہ بیٹھیں گے۔ آپ زمینداری کے جملہ معاملات خود سنبھالیں گے۔ اس طرح منشیوں کے تقرر کی ضرورت نہیں ہو گی۔ کاشت کی منصوبہ بندی اور نگرانی آپ خود کریں گے تو اس میں آپ کا وقت اور محنت صرف ہو گی۔ آپ اس کا معاوضہ پانے کے حقدار ہوں گے۔ لہذا زمین سے جو یافت ہو گی اس میں آپ کا ذاتی حصہ اچھا خاصا ہو گا۔ یوں آپ اہلیہ سے نان نفقہ پانے کے الزام سے بری ہوں گے۔ یہ دلیل مولانا کو قائل کرنے کا باعث بنی اور وہ رقبہ پر منتقل ہو گئے۔

مذکورہ زمین ضلع شیخوپورہ میں واقع قصبہ خانقاہ ڈوگراں سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ مختصر آبادی کے گاؤں کا نام مولانا نے رحمان آباد رکھا۔ اس میں شہری سہولتیں بالکل نہ تھیں حتی کہ بجلی بھی نہ تھی۔ مکانات کچے تھے۔ گلیوں میں گائیں بھینسیں بندھی ہوئی ہوتیں اور غلاظت کے انبار پھیلے ہوتے۔ مکھیوں اور مچھروں کی بھرمار تھی۔ گرمی خوب پڑتی۔ آبادی ناخواندہ تھی اور مولانا کی علمی باتوں کو سمجھنے والا اور ان کی قدر کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے باوجود مولانا کو دیہی زندگی سے بے حد انس تھا۔ وہ زمینوں کی دیکھ بھال بڑی جاں فشانی سے کرتے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز فجر اور پھر نماز عصر کے بعد رقبے پر جاتے۔ کاشت کی نگرانی کرتے۔ کسانوں کو بر سر موقع ہدایات دیتے۔ نہری پانی ملنے کی باری اگر رات کو ہوتی تب بھی رات کو اٹھ کر رقبہ پر جاتے۔ گاؤں کی زمین کینو کی کاشت کے لیے موزوں پائی تو بڑے اہتمام سے کینو کے دو باغ لگوائے۔ وہ ایک ایک بوٹے پر توجہ دیتے اور بروقت کسانوں کو ہدایات دیتے۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین سے آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا اور باغ جب پھل دینے پر آئے تو ٹھیکہ سے کافی آمدنی ہوتی۔

مولانا کا رقبے پر آنا جانا صرف زمینی مسائل کے حل کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے تفسیری مشکلات کے حل کے لیے بھی ضروری سمجھتے تھے۔ جو کچھ انہیں لکھنا ہوتا اس کے اسلوب کو متعین کرنے کے لیے سیر کا یہ وقت بڑا موزوں ہوتا۔ مولانا قرآن مجید کو صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر بھی کتاب ہدایت سمجھتے اور اس کے مطابق اقدام کرنے کے عادی تھے۔ سورہ کہف میں باغ والے کا ایک قصہ بیان ہوا ہے کہ اس کا باغ درختوں سے گھرا ہوا تھا اور بیچ بیچ میں کاشت کی جاتی تھی' مولانا نے وہیں سے اپنے

باغ کا نقشہ اخذ کیا۔ زمین کے گردا گرد شیشم کے درخت لگوائے۔ درمیان میں کینو کے پودے تھے اور ان کے بیچ کی زمین پر کاشت ہوتی تھی۔ مولانا باغ میں داخل ہوتے وقت ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ۔ (جو کچھ اللہ نے چاہا عطا فرمایا' اللہ کے بغیر ہماری کوئی طاقت نہیں) پڑھتے اور اپنی عبودیت و ممنونیت کا اقرار کرتے۔

شہر کے ہنگاموں اور مصروفیات سے چھٹکارا ملا تو تفسیر لکھنے کے کام میں تیزی آ گئی۔ مولانا نماز فجر کے بعد رقبے کا چکر لگا کر واپس آتے' ناشتہ کرتے اور گاؤں سے متصل واقع دیہی کونسل کی عمارت میں چلے جاتے۔ وہاں کسی شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر تفسیر لکھتے جس پر غور انہوں نے سحری کے وقت کر لیا ہوتا۔ ظہر کے وقت کچھ آرام کرتے۔ پھر آگے کی آیات کا مطالعہ کر کے ان کے نکات پر غور عصر کی سیر کے دوران کرتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آیات کا نظم سمجھ میں نہ آتا یا کسی مضمون کو ادا کرنے کا اسلوب ہاتھ نہ آتا تو وہ کئی کئی روز تک فکر و تدبر جاری رکھتے اور لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ حلقہ تدبر قرآن کے رفقا معمولاً مہینہ میں ایک بار حاضر ہوتے تو مولانا اس دوران پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ فرماتے۔ اگر کوئی چیز تحقیق طلب ہوتی تو راقم کے حوالے کرتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا نے راقم کو اپنا نقطہ نظر لکھ کر پیش کرنے کو کہا اور جب اس نے اپنی سوچ کے مطابق تفسیر لکھ کر دی تو مولانا نے خوش ہو کر فرمایا کہ تم نے بات کو ٹھیک سمجھا اور اس سے مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

گاؤں میں ایک مسجد تھی۔ مولانا اس میں جمعہ کی نماز پڑھاتے۔ خطبہ سننے والے کسانوں کے لیے ان کا پیغام یہ ہوتا کہ ان کے لیے اپنے رب کو یاد رکھنا اور اس پر اعتماد و توکل کرنا بے حد آسان ہے کیونکہ ایک کسان بیج ڈالنے سے لے کر فصل اٹھانے تک برابر اللہ تعالیٰ ہی سے امید رکھنے والا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسان اس حقیقت کو فی الواقع دل میں جگہ دے لیں تو وہ اللہ کے ہاں بڑا مرتبہ پا سکتے ہیں۔ مولانا گاؤں میں ابھرنے والے جھگڑوں کو نمٹانے میں بھی دلچسپی لیتے اور غریب لوگوں کی پشت پناہی کرتے۔

گاؤں میں مولانا کے تلامذہ کے علاوہ ان کے احباب اور بعض اہل علم بھی کبھی کبھار ملنے کے لیے پہنچ جاتے۔ راقم کا جانا ہوتا تو مولانا تمام ایسے مہمانوں کا تذکرہ فرماتے۔ وہ اکرام ضیف کی ہدایت پر عمل کرتے تھے۔ جب مہمان آتا تو بے حد خوش ہوتے اور تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ گاؤں میں انہیں واحد پریشانی علاج معالجہ کی سہولتوں کے فقدان کی تھی۔ بیگم صاحبہ شوگر کی مریض تھیں۔ ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تو مولانا کو کسی پہلو چین نہ آتا۔ بالآخر یہی چیز انہیں واپس لاہور لانے کا باعث بنی۔ 1979ء میں وہ پھر سے لاہور منتقل ہو گئے اور اگست 1980ء میں تفسیر تدبر قرآن مکمل ہوئی۔

تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل: تفسیر تدبر قرآن مولانا اصلاحی کی زندگی کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا اعزاز کسی کو کم ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے بڑی مشقت اٹھائی اور بڑی قربانیاں دیں۔ فرماتے

تھے کہ میں نے قرآن کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بڑی محنت کی ہے۔ میری مادری زبان پوربی تھی لیکن دس سال کی عمر سے میں نے اردو اختیار کی۔ دلی کے محاوروں کے لیے غالب' میر' نذیر احمد' حتی کہ شرر کو بھی پڑھا۔ شاعروں کے دیوان پڑھ پڑھ کر عربی زبان کے اسالیب کو اردو میں ڈھالا اور ان کو تدبر قرآن میں جگہ دی۔ کلام عرب کو سیکھنے کے لیے بے حد محنت کی ضرورت ہے۔ عام طور پر لوگ عرب جاہلیت کے مزاج سے ناواقف ہیں اس لیے وہ آیات کا منشا اور زور سمجھ نہیں پاتے۔ اور تو اور مولانا شبلی تک بھی قریش کے مینتروں سے واقف نہیں ہو سکے اور سیرت میں کئی جگہ غلطی کر گئے ہیں۔

لوگ کئی بار مولانا سے ان کی تفسیر کا انداز مشکل ہونے کی شکایت کرتے تو مولانا یہ جواب دیتے کہ بڑی ضرورت قرآن فہمی میں لوگوں کا انداز فکر بدلنے کی ہے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ میں قرآن مجید کی آیات کا مفہوم زبان' اسالیب زبان اور نظام زبان کی روشنی میں اس قدر مدلل طور پر واضح کر دوں کہ قرآن کا بڑے سے بڑا منکر بھی کہہ اٹھے کہ بات وہی ہے جو قرآن کہتا ہے۔ یہ مقصد افادۂ عام کے لیے لکھی ہوئی تفسیر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ مولانا اصلاحی کے نام اپنے مکاتیب میں تفسیر کی برابر تحسین فرماتے رہے۔ وہ لکھتے کہ میں اپنے درس قرآن کے لیے اسی میں سے تیاری کرتا ہوں۔ اس کی مدد سے میرا درس بے حد مفید ہو جاتا ہے۔ میں برابر دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں اس کی تکمیل کرا دے۔ 30 رمضان المبارک 1400ھ کو انہوں نے مولانا کے نام ایک خط لکھا اور بتایا کہ اس کے لکھنے کا محرک ایک خواب ہوا ہے جو آپ کے لیے اور آپ کی اہلیہ محترمہ کے لیے خوش کن ہو گا۔

"رات تین بجے سے کچھ پہلے دیکھا کہ میں آپ کے مکان پر پہنچا ہوں۔ یہ مکان کسی شہر میں نہیں ہے بلکہ کسی اچھے ترقی یافتہ قسم کے دیہات میں ہے۔ مکان بہت بڑا ہے جیسے پرانے زمانہ میں دیہات میں زمینداروں کے مکانات ہوتے تھے۔ بالکل پرانے طرز کا ہے۔ میرے پہنچنے سے آپ کو بے حد خوشی ہوئی ہے۔ میں مکان میں داخل ہوا تو دیکھا ایک بہت بڑا دیگچہ..... یہ کہنا چاہیے کہ چھوٹی قسم کی دیگ..... چولہے پر ہے۔ اس میں زردہ تیار ہو رہا ہے۔ دیگ کھلی ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ زردہ بہت اعلیٰ قسم کا ہے اور تیاری کے قریب ہے۔ آپ نے میری وجہ سے بہت سے لوگوں کو مدعو کر رکھا ہے۔ ایک بڑے کمرے میں دری کا فرش ہے۔ آپ مجھے وہاں لے گئے۔ اور حضرات بھی آ گئے۔ آپ نے مجھے بتایا کہ میری اہلیہ کو آپ کی آمد کی مجھ سے زیادہ خوشی ہے۔ خواب کے بس یہی اجزا محفوظ رہ گئے ہیں۔ تعبیر یہی ذہن میں آئی کہ تدبر قرآن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تیاری کے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ آپ کے ہاتھ سے اس کا اتمام ہو گا اور انشاء اللہ قبول ہو گی۔ غذاؤں میں زردہ مجھے خاص طور سے مرغوب ہے۔"

مولانا نعمانی کا یہ مکتوب فی الواقع تدبر قرآن ہی کے متعلق تھا کیونکہ مولانا نے اس کی تکمیل 29 رمضان المبارک 1400ھ کے روز کی تھی۔ اس کی تکمیل پر وہ اپنے احساسات ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں:

"۲۹ رمضان ۱۴۰۰ھ کو اس کتاب کی آخری سطریں حوالۂ قرطاس کرتے ہوئے میں نے صرف یہی نہیں محسوس کیا کہ یہ کتاب میں نے پوری کر دی بلکہ یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی زندگی کا آخری ورق بھی الٹ دیا۔ ایک بھاری بوجھ جو تیس سال اٹھائے لیے پھرا اس سے سبکدوش ہونے پر ایک گہری مسرت کا احساس تو ایک فطری چیز ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ اب کیا کام کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے جس کے لیے جینے میں لذت ہو۔ میں نے آخری سطریں لکھ کر اپنا سر اپنے رب کے آگے ڈال دیا اور صرف یہ دعا کی کہ اے رب' اگر تو نے اپنی کتاب عزیز کی خدمت کی یہ توفیق بخشی تو اس کو قبول بھی فرما اور اس کو اپنے غلام کی نجات کا ذریعہ بنا۔ بس اس کے سوا میں کسی چیز کا متمنی نہیں۔"

مولانا نے تفسیر کی تکمیل کی خبر مولانا نعمانی کو دی تو انہوں نے اصرار کیا کہ اس موقع پر ایک جشن کا اہتمام ہونا چاہیے۔ مولانا نے لکھا کہ میں تو اس طرح کی چیزوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ البتہ اگر آپ صدارت کے لیے تیار ہوں تو میں اس میں شریک ہوں گا اور اس کا اہتمام بھی کروں گا۔ لیکن مولانا نعمانی کی یہ تجویز عمل میں نہیں آ سکی۔

ادارہ تدبر قرآن و حدیث:- تفسیر کی تحریر کا کام جوں جوں اختتام کے قریب آ رہا تھا مولانا کو یہ خیال رہا کہ تکمیل کے بعد اگر عمر اور صحت نے اجازت دی تو وہ اس طرح کی ایک کتاب حدیث پر بھی لکھیں گے۔ وہ اس بارے میں اپنے رفقا اور شاگردوں سے برابر مشورہ کرتے رہتے۔ ان سب کی غالب رائے یہی تھی کہ مولانا کو باقی عمر حدیث کی خدمت کے لیے وقف کرنی چاہیے۔ اسی دوران جناب جاوید احمد نے تجویز پیش کی کہ ایک ادارہ اس مقصد کے لیے قائم کر لیا جائے۔ چنانچہ مولانا نے فیصلہ کیا کہ حلقہ تدبر قرآن کو' جو ایک طویل عرصہ سے ان کی زیر سرپرستی اور راقم کی نگرانی میں کام کر رہا تھا' وسعت دے کر ایک ادارہ کی شکل دے دی جائے اور آئندہ کام اس کے تحت سرانجام دیا جائے۔ یہ ادارہ "ادارہ تدبر قرآن و حدیث" کے نام سے ایک دستور کے تحت یکم محرم 1401ھ کو جناب محمد نعمان علی کی قیام گاہ پر قائم ہوا۔ مولانا اس کے صدر اور راقم ناظم مقرر ہوا۔ ادارہ کے تحت مولانا نے ہفتہ وار درس قرآن کا وہی سلسلہ جاری رکھا جس کا آغاز گاؤں سے ان کی واپسی پر ہو چکا تھا۔ اسی طرح ہفتہ وار نشست میں حدیث کے اصولوں پر انہوں نے لیکچر دیے جو اس وقت "مبادی تدبر حدیث" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ کتب حدیث میں پہلے موطا امام مالک اور اس کے بعد صحیح بخاری کا درس ہوا۔ اول الذکر کتاب مکمل طور پر پڑھی گئی جب کہ صحیح بخاری کا درس 1993ء میں معطل ہو گیا۔ ادارہ کی تحقیقات اور مولانا کے دروس کی

اشاعت کے لیے رسالہ تدبر کا اجرا عمل میں آیا جو ایک سلسلہ منشورات کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔ مولانا نے فلسفہ کے بنیادی مسائل پر قرآن مجید کا نقطہ نظر بھی واضح کیا۔ ان کی اسی دور کی تحقیقات پر مبنی کتابیں "تزکیہ نفس" اور "فلسفہ کے بنیادی مسائل" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کی تمام کتب فاران فاؤنڈیشن شائع کرتا ہے جس کے مالک مولانا کے ایک شاگرد جناب ماجد خاور ہیں۔ انہوں نے مولانا کو اشاعت کتب کی پریشانیوں سے آزاد کیے رکھا۔

1993ء میں پیری کی نقاہت کے باعث مولانا نے دروس کا سلسلہ منقطع کیا۔ اس وقت ان کی عمر نوے برس تھی۔ عام طور پر لوگ اس سے کہیں پہلے ناکارہ محض ہوتے ہیں لیکن مولانا چاق و چوبند اپنے اسی محاذ پر کام کرتے رہے جس کا ذمہ انہوں نے پون صدی قبل اٹھایا تھا۔ درس کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد بھی وہ علمی مسائل میں رہنمائی دیتے رہے حتیٰ کہ بیماریوں نے ان کو آگھیرا' یہاں تک کہ اللہ کا یہ بندہ اپنے رب سے جاملا۔

قرآن پر تدبر کا طریقہ :- 1925ء میں مولانا فراہی کی شاگردی میں آنے کے بعد سے آخر عمر تک مولانا کا معمول یہ رہا کہ وہ صبح تین بجے بیدار ہو جاتے۔ نماز تہجد ادا کر کے قرآن مجید کا مطالعہ کرتے۔ ایک سورہ ان کے زیر غور ہوتی جس کے ایک ایک لفظ اور آیت پر وہ ڈیرے ڈالتے۔ اس سورہ سے پہلی اور پچھلی سورہ بھی زیر مطالعہ رکھتے۔ اس کے علاوہ پورے قرآن کی تلاوت الگ سے جاری رہتی۔ وہ متصل سورتوں کے مضامین کی مماثلتوں پر غور کرتے اور پورے قرآن میں سے ان کے حق میں نظائر تلاش کرتے۔ اسی طرز تدبر سے وہ اس حقیقت تک پہنچے کہ قرآن میں دو دو سورتیں مل کر ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔ ان میں تعلق اجمال اور تفصیل کا بھی ہو سکتا ہے' دو مختلف انداز استدلال بھی ہو سکتے ہیں۔ دونوں میں سے ایک' دوسری کے برعکس مضمون کی حامل ہو سکتی ہے' نیز ایک کی حیثیت دوسری کے تتمہ اور تکملہ کی بھی ہو سکتی ہے۔ علی ھذا القیاس مولانا اس نتیجہ پر بھی پہنچے کہ قرآن مجید کی سورتوں کے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک خاص مضمون کا حامل ہے جو اس گروپ کا عمود ہے۔ تمام سورتیں اسی عمود کے ساتھ متعلق اور اس کے کسی نہ کسی پہلو کو واضح کرتی ہیں۔ ہر سورہ اندرونی طور پر بھی مربوط مضامین کی حامل ہوتی ہے۔

مولانا کے یہ نتائج فکر ایسے ہیں جنھوں نے مستشرقین کی دو صدیوں کی ان کاوشوں کو خاک میں ملا دیا ہے جو وہ قرآن کو ایک بے ربط کتاب قرار دینے اور اس کو نئی ترتیب دینے کے لیے کرتے اور دنیا کو یہ باور کراتے رہے کہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کے اقوال کو صحیح طور پر ایڈیٹ نہیں کیا۔ مولانا کی تفسیر نے ثابت کیا کہ قرآن کی ہر آیت بالکل درست طور پر اپنے مقام پر رکھی گئی ہے۔ ہر سورہ کو جو مقام ملا ہے وہی اس کے لیے موزوں ترین مقام ہے۔ پورے قرآن کے مضامین میں ترتیب قائم ہے۔ اس کو کہیں سے

الٹ پلٹ دیا جائے تو کتاب کا حسن باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب مغرب میں اس تفسیر کی خصوصیات زیر بحث آ رہی ہیں اور مستشرقین نظم قرآن کے تصور اور حقیقت کو دوبارہ زیر غور لا رہے ہیں۔

مولانا اپنے استاد امام فراہیؒ کا قول سنایا کرتے تھے کہ قرآن کو ہمیشہ اپنی ہدایت کے لیے پڑھو۔ فرماتے تھے کہ استاد کے اس قول پر عمل کرنے کے نتیجہ میں ایک مرحلہ ایسا آ جاتا ہے جب آدمی کا علم ابلا پڑتا ہے اور وہ بے چین ہو جاتا ہے کہ اپنے علم سے آس پاس والوں کو بھی روشناس کرائے۔ جب وہ ایسا کرنے لگتا ہے تو وہ اسی طرح مبارک ہو جاتا ہے جیسے آسمان سے برسنے والا پانی زمین کی روئیدگی کے لیے مبارک ہوتا ہے۔ مولانا نے خود یہی مبارک زندگی گزاری جو ان کی جوانی اور بڑھاپے دونوں پر محیط ہے۔

لمبے وقفوں کے بعد دیے جانے والے درسوں کی افادیت کے مولانا زیادہ قائل نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان میں بیشتر شرکائے درس محض برکت کے حصول کی نیت سے آتے ہیں' قرآن فہمی ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ فرماتے کہ ہمارے پیش نظر یہ بات ہے کہ قرآن کا صحیح فہم دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ درس باقاعدہ ہوں اور کم وقفوں کے ساتھ دیے جائیں۔ ایسے دروس میں شرکاء کی تعداد بے معنی ہوتی ہے۔ ہمیں ایک بھیڑ اکٹھی کرنے کے بجائے ان چند افراد کو تلاش کرنا چاہیے جو دل لگا کر کتاب الٰہی کو سمجھنا چاہتے ہوں۔

اپنے شاگردوں کے لیے مولانا کی نصیحت یہ ہوتی کہ ناقدروں کو کچھ نہیں ملا کرتا۔ قرآن کی قدر کرو گے تو بہت کچھ ملے گا۔ جاننے سے پہلے بانٹنے کی کوشش کبھی نہ کیجئے۔ ہزاروں خام باتیں بتانے سے اچھا یہ ہے کہ ایک ہی بات' لیکن صحیح بات' بتائی جائے۔ مولانا کی تلقین یہ بھی ہوتی کہ میں نے قرآن کا علم مفت پایا اور اسے مفت بانٹتا ہے۔ تم بھی اسے مفت پھیلانا۔ اگر اس کا حق ادا نہیں کرو گے تو یہ علم میرے پاس واپس آ جائے گا۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ چوری کے مال سے دکان نہیں سجا کرتی۔ کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے سرقہ کر کے علم حاصل نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ بیان کیا کہ مولانا فراہیؒ کے پاس ملاقاتی آتے تو عجیب و غریب سوالات کرتے۔ بعض لوگ ان کو مشورے دینے لگتے۔ مولانا ہر شخص کی بات بڑی خاموشی اور متانت سے سنتے اور کسی کسی وقت سبحان اللہ یا الحمد للہ کہہ دیتے لیکن بحث بالکل نہ کرتے۔ میں نوجوان تھا۔ مجھے لوگوں کی یہ حرکت بے حد کھلتی۔ لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں کہتا کہ ان صاحب کی فلاں بات تو قابل بحث تھی۔ آپ نے خاموشی سے اس کو سن لیا۔ مولانا اس کا جواب یہ دیتے کہ ہر بات میں الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مولانا اصلاحی فرماتے کہ استاد کی یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن تفسیر تدبر قرآن لکھتے وقت اس نے مجھے بہت فائدہ دیا ہے۔

حکومتی مناصب کے بارے میں رویہ :- 1956ء میں پاکستان کے آئین کے تقاضا کے تحت ایک

اسلامک لاء کمیشن قائم کیا گیا تو حکومت نے مولانا اصلاحی کو بھی اس کا رکن بنایا۔ یہ کمیشن تقریباً دو سال کام کر سکا اور جنرل محمد ایوب خان کے مارشل لاء نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کمیشن کی ترکیب اور مقاصد و طریقہ کار سے مولانا اس نتیجہ تک پہنچے کہ حکومت اسلامی قانون یا نظام کے نفاذ میں مخلص نہیں۔ اس طرح کے ادارے قائم کرتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی کام ڈھنگ سے نہ ہو سکے اور مختلف سوچ رکھنے والے ارکان آپس میں چونچیں لڑاتے رہیں۔ یہ محض دفع الوقتی اور لوگوں کو خاموش کرانے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد مولانا نے ہر ایسی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

جنرل محمد ایوب خان کے دور حکومت میں مخالف پارٹیوں نے مل کر مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لیے نامزد کیا۔ جماعت اسلامی نے اس نامزدگی کی تائید کی اور اس کے حق میں لٹریچر تیار کیا۔ مولانا نے اس نامزدگی کی پرزور مخالفت کی اور جماعت کے موقف کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ یہ مضامین رسالہ میثاق میں چھپے۔ چونکہ یہ ایوب خان کے حق میں جاتے تھے اس لیے حکومت نے ان کو اپنے اہتمام میں چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔ ایوب خان صدر منتخب ہو گئے۔ لاہور آئے تو مولانا سے گورنر ہاؤس میں ملاقات کی۔ ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی تحریروں سے ان کو بے حد فائدہ ہوا۔ اس کے بعد صدر نے پیشکش کی کہ مولانا پبلک میں آئیں۔ حکومت ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے گی اور ان کی پسند کے میدان میں ان کو کسی اہم منصب پر فائز کرے گی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مولانا شدید مالی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود صدر صاحب کو ان کا جواب یہ تھا کہ مضامین میں نے آپ کی حمایت میں نہیں لکھے بلکہ عورت کی سربراہی کے بارے میں دینی موقف کی وضاحت کے لیے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ میں جو کام اس وقت کر رہا ہوں وہ میری زندگی کا مشن ہے۔ اس میں میں کسی چیز کو رکاوٹ بننے نہیں دینا چاہتا۔ لہٰذا شکریہ کے ساتھ آپ کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت چاہتا ہوں۔

جون 1972ء کا واقعہ ہے۔ مولانا ان دنوں اپنی بیماری سے اٹھے تھے۔ ایک صاحب ملنے آئے اور مولانا سے سیاست کے رنگ ڈھنگ کے بارے میں پوچھا۔ مولانا نے جواب دیا کہ میں نے چھ ماہ سے اخبار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اخبار کی سرخیاں اب دیکھنے لگا ہوں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ایک بڑے بحران کے دروازہ پر کھڑے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ عوامی حکومت اس بحران کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس کے بعد وہ شخص مولانا کے مصارف اور وسائل کی بابت پوچھنے لگا۔ مولانا نے جواب دیا "مہنگائی کا زمانہ ہے' مصارف کافی زیادہ ہوتے ہیں لیکن خدا دیتا ہے۔ اسی پر بھروسہ ہے۔" کہنے لگا "آپ جیسے قابل لوگوں کی سرپرستی تو حکومت بھی کرتی ہے"۔ مولانا نے جواب دیا "کرتی ہو گی۔ لیکن میں نے کبھی کسی حکومت کا ساتھ نہیں دیا۔ ہر حکومت پر تنقید کرتا رہا ہوں۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ ایسے شخص کی سرپرستی کرے۔" اس نے کہا "آپ خود اس کے لیے درخواست نہ بھی کریں تو دوسرے لوگ آپ کے لیے تگ و دو کر سکتے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا "یہ حرکت وہی شخص کر سکتا ہے جو مجھ سے واقف نہ ہو۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ حکومتوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ان کے خوشامدیوں اور وظیفہ خواروں کے ہاتھوں آج تک کون سا کارنامہ انجام پایا ہے۔" اس پر وہ آدمی مولانا سے اجازت لے کر چل دیا۔

مولانا جب رحمان آباد میں تھے تو ضلع کے ڈپٹی کمشنر ان کی ملاقات کے لیے گاؤں پہنچے اور بتایا کہ بھٹو صاحب کی حکومت آپ کی دینی خدمات کے صلہ میں سول ایوارڈ دینا چاہتی ہے۔ اس بارے میں پہلے آپ کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ مولانا نے یہ پیشکش شکریہ کے ساتھ مسترد کر دی اور فرمایا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا۔ میں اس کا اجر اپنے رب سے چاہتا ہوں۔

اگست 1977ء میں مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے مولانا کو مشاورتی کونسل کی رکنیت پر آمادہ کرنے آئے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تین اسباب کی بنا پر رکن بننا پسند نہیں کرتا۔ ایک یہ کہ مجھے ثقل سماعت کا عارضہ ہے۔ میں جب کسی کی سن نہیں سکتا تو مجھے سنانے کا حق بھی نہیں۔ دوسری یہ کہ میں ہمہ تن تفسیر لکھنے میں مصروف ہوں۔ کسی دوسری چیز کی طرف توجہ دوں گا تو تفسیر لکھنے کا کام متاثر ہو گا جو مجھے قطعاً گوارا نہیں۔ تیسرا یہ کہ جنرل صاحب تین ماہ کے لیے حکومت سنبھال رہے ہیں تو اس طرح کے طول طویل کاموں میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کا یہ اقدام مناسب نہیں۔

جنرل صاحب نے جب حکومت میں اپنے قدم جما لیے تو مولانا سے ملنے آئے۔ انہوں نے پھر ذاتی طور پر پیشکش کی کہ وہ مولانا کی ضروریات کو پورا کرنے کو سعادت سمجھیں گے۔ لیکن مولانا نے فرمایا کہ میں ایک درویش آدمی ہوں۔ میری کوئی ضروریات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر سہولت فراہم کر رکھی ہے اور میں نہایت اطمینان سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔

کردار کے بعض پہلو:- مولانا اصلاحی نے زندگی کا جو مقصد متعین کیا' آخر دم تک اس کو نبھایا۔ حالات سرد و گرم رہے اور ان میں بڑے نشیب و فراز آئے لیکن مولانا نے کبھی اپنے مقصد حیات کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ایسی استقامت کم ہی لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔

مولانا نہایت حساس طبیعت کے مالک تھے۔ اخباروں میں قتل و غارت گری کی خبریں پڑھتے تو ان کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ انہیں دکھ ہوتا کہ انسان اس قدر خونخوار کیوں ہو رہا ہے۔ ملک کے دشمنوں کی کارروائیاں علم میں آتیں تو دعائیں کرتے کہ اے میرے رب' تیرا یہ عاجز بندہ بھی اس کشتی میں سوار ہے۔ تو اس کشتی کو طوفانوں سے محفوظ رکھ۔

مولانا کے بڑے بیٹے ابو صالح ایڈیٹر مشرق ملک کے ایک نامور صحافی تھے۔ وہ پی آئی اے کی قاہرہ کی اس پرواز میں لقمہ اجل بنے جس کو مصر میں حادثہ پیش آگیا تھا۔ مولانا حادثہ کی خبر سنتے ہی سربجود ہو گئے

اور اپنے رب سے صبر و استقامت کی دعا کی۔ لوگ تعزیت کے لیے جمع ہونے لگے تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مولانا پر غم کا یہ پہاڑ جب ناقابل برداشت ہونے لگتا تو مجلس سے اٹھ جاتے اور نماز پڑھنے لگتے۔ اس طرح انہوں نے مصائب و آلام کے مواقع پر استعینوا بالصبر والصلوۃ (صبر اور نماز کے ذریعے مدد چاہو) کی قرآنی ہدایت پر عمل کر کے اس ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ راقم کا تجربہ یہ ہے کہ وہ ہر معاملہ کی کنہ و حقیقت معلوم کرنے کے لیے فی الفور قرآن کی طرف متوجہ ہو جاتے اور دیکھتے کہ اس صورت حال میں اس کی تعلیم کیا ہے۔ جب وہ اس کا تعین کر لیتے تو پھر اس پر استقامت دکھاتے' خواہ اس کے لیے انہیں بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔

رجم کی سزا کے اطلاق کے بارے میں ان کی رائے کے باعث ملک و بیرون ملک میں ان کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے مخالفین کے تمام دلائل پر غور کرنے کے بعد اپنے موقف کو قرآن کے نصوص کی روشنی میں درست سمجھا اور پھر کسی دوستی' لالچ یا دھمکی کو خاطر میں نہیں لائے۔ اس موقع پر ایک گروہ کی طرف سے انہیں دھمکیاں ملیں کہ وہ اپنی رائے واپس لیں ورنہ انہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ پھر انہیں یہ کہا گیا کہ ہم آپ کو عدالتوں میں گھسیٹیں گے۔ مولانا کا جواب یہ تھا کہ ضرور ایسا کیجئے تاکہ مجھے کچھ اور باتیں کہنے کا موقع ملے جو میں ابھی تک زبان پر نہیں لایا۔ ان کے ایک عزیز دوست نے مولانا کے اپنی رائے پر اصرار کو خلاف مصلحت قرار دیا تو انہوں نے جن الفاظ میں جواب دیا' وہ ان کی زندگی کے نہج کو سمجھنے میں مدد دے گا:

"میرے اور آپ کے درمیان ایک اصولی اختلاف ایسا ہے کہ میں آپ کو اپنی کسی رائے کا قائل نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہ میں کوئی رائے اختیار کرنے میں اصل اہمیت دلیل کو دیتا ہوں' اشخاص کی اہمیت میرے نزدیک ثانوی ہے۔ اس کے برعکس آپ کا اصل اعتماد اشخاص پر ہوتا ہے' دلیل کو آپ دوسرے درجہ میں رکھتے ہیں۔ میں اس معاملہ میں آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ اول تو اس میں مزاج کو دخل ہے۔ ثانیاً میری ذمہ داریاں آپ کی ذمہ داریوں سے مختلف ہیں۔ مجھ پر تحقیق سے اگر کوئی حق واضح ہو جائے تو واجب ہے کہ اس کو عندالضرورت برملا کہوں' اگرچہ میرا سر قلم کر دیا جائے۔ لیکن آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے۔"

بعض لوگ مولانا کو زود رنج اور غصیلی طبیعت کا سمجھتے ہیں لیکن عملاً وہ ایسے نہیں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بڑی دیر تک ہر معاملہ پر غور کرتے اور اس کی حیثیت کے تعین کے لیے موافق و مخالف دلائل کو دیکھتے۔ اس کے بعد جب وہ اس میں حق کا پہلو متعین کر لیتے تو مخالفین کے ساتھ رعایت برتنے کے قائل نہ تھے۔ ذاتی زندگی میں وہ بے حد شفیق و ہمدرد' ملنسار اور مروت ظاہر کرنے والے تھے۔ حق کے لیے غیرت کو وہ ایمان کا جزو قرار دیتے تھے۔ ہیجڑا پن سے انہیں نفرت تھی۔

مولانا کی رحلت ان کے اعزہ و تلامذہ ہی کا نقصان نہیں بلکہ ایک قومی و ملی نقصان ہے۔ ایسی

شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے' ان کی نیکیوں اور خدمات دینی کو قبول فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے۔ آمین

مولانا اصلاحی جس فکر کے حامل تھے اب اس کا تعارف "فکر فراہی" کے نام سے ہوتا ہے۔ اس کی آبیاری میں انہوں نے جو مشقت اٹھائی ہے اس کے نتائج اب دنیا کے سامنے اور ملت کا سرمایہ ہیں۔ اس کو جانچنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ مولانا کی زندگی ہی میں ملک و بیرون ملک کئی یونیورسٹیوں میں تفسیر تدبر قرآن میں اختیار کردہ انداز تفسیر پر تحقیقی کام ہونے لگا تھا۔ ملکی یونیورسٹیوں نے بالعموم مولانا کے تفردات کو موضوع بحث بنایا جب کہ بیرون ملک تصور نظم قرآن کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا وہ قرآن کو محور بنا کر لکھا۔ انہوں نے اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر ڈیرے لگائے۔ اس کے مدعا کو سمجھا اور اس کو اپنی فکر کی اساس بنایا۔ لہٰذا قرآنی مضامین ہوں یا دلائل یا طرز استدلال' مولانا نے ہر چیز کو اپنی تحریروں میں سمویا۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میری کسی رائے کو نظر انداز کرنے سے پہلے سو بار سوچنا کیونکہ میں نے برسوں کے غور کے بعد ہر بات کی اصل قرآن مجید میں ڈھونڈنے کی سعی کی ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کام کرنے کا اہل وہی شخص ہے جس کی نظر پورے قرآن پر ہو اور وہ اس میں غور کرنے کا عادی ہو۔

مولانا کے فکر کو سمجھنا' اس کی خصوصیات کا تعین کرنا' ان کی تفسیر اور دوسری تحریروں پر نقد و تبصرہ کرنا اور پھر اس رنگ میں ان پر اضافے کرنا آسان کام نہیں' نہ یہ کسی ایک شخص کے بس کی بات ہے۔ یہ کام کسی نہ کسی طور پر اب ہوتا رہے گا۔ لوگ معلوم کریں گے کہ اس مرد درویش نے قرآن' حدیث' فقہ' قانون اور فلسفہ میں امت کو کیا کچھ دیا ہے۔ راقم سطور اس موقع پر مولانا کے تلامذہ' اعزہ' احباب اور ان سے شرف صحبت رکھنے والوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مولانا کی شخصیت' فکر اور خدمات علمی کے بارے میں جس پہلو کے بارے میں علم رکھتے ہوں وہ اسے حیطہ تحریر میں لائیں تاکہ یہ معلومات تدبر میں شائع کر کے افادہ عام کے لیے محفوظ کر دی جائیں۔ اسی طرح جن لوگوں کے پاس مولانا کے خطوط موجود ہوں وہ بھی ادارہ کو مہیا کریں تاکہ ان سے دوسرے لوگوں کو بھی مستفید ہونے کا موقع مل سکے۔ یہ خطوط جب لکھے گئے اس وقت ان کا فائدہ انفرادی تھا لیکن اب یہ ایک ملی سرمایہ ہیں' جس کا فیض ہر شخص کو پہنچنا چاہیے۔ اگرچہ مولانا کے خطوط اور لوگوں کی تحریریں آئندہ بھی شائع کی جاتی رہیں گی لیکن اگر یہ فروری کے آخر تک مہیا کر دی جائیں تو اگلے شمارہ میں ان کو جگہ دی جا سکے گی۔ امید ہے کہ قارئین تعاون فرمائیں گے۔

تفسیر سورہ نور

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

یہ ایک اہم سورہ ہے جو ہم نے نازل کی ہے اور اس کے احکام ہم نے فرض ٹھہرائے ہیں اور اس
میں ہم نے نہایت واضح تعلیمات بھی اتاری ہیں تاکہ تم اچھی طرح یاد رکھو[1] ○ 1
زانی عورت اور زانی مرد' دونوں میں ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو[2] اور خدا کے قانون کی تنفیذ کے
معاملے میں ان کے ساتھ کوئی نرمی تمہیں دامن گیر نہ ہونے پائے اگر تم اللہ اور روز آخر پر سچا ایمان
رکھتے ہو۔ اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے ○ 2
زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا
مشرک[3] اور اہل ایمان پر یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی ہے ○ 3
اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں' پھر اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہ
کریں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔[4] یہی لوگ اصلی فاسق ہیں○
جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں گے تو اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے○ اور
جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے پاس ان کی ذات کے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ان کی گواہی
کا طریقہ یہ ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ وہ سچے ہیں○ اور پانچویں بار یہ کہیں کہ ان پر اللہ
کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹے ہوں○ اور عورت سے سزا کو یہ چیز دفع کرے گی کہ وہ چار بار اللہ کی قسم
کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے○ اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر یہ شخص سچا ہو
[5] ○ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کا کرم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ توبہ قبول فرمانے والا
اور صاحب حکمت ہے تو تم اس کی پکڑ میں آ جاتے[6] ○ 10
جن لوگوں نے فتنہ افک برپا کیا وہ تمہارے ہی اندر کا ایک گروہ ہے۔ تم اس چیز کو اپنے لیے بری
نہ خیال کرو بلکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کے حساب میں

پڑا اور جو اس فتنہ کا اصل بانی ہوا ہے اس کے لیے تو ایک عذاب عظیم ہے[7] ○ 11
ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کی
بابت نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان ہے○ 12
آخر یہ لوگ اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہ کیوں نہ لائے! تو جب یہ لوگ گواہ نہیں
لائے تو لازماً" اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں○ 13
اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی' دنیا اور آخرت میں' تو جس چیز میں تم ملوث ہو
گئے تھے اس کے باعث تم کو ایک عذاب عظیم آ پکڑتا○ خیال کرو جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات
نقل کر رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کی بابت تمہیں کوئی علم نہیں تھا۔
اور تم اس کو معمولی بات خیال کر رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی بات ہے○ ایسا
کیوں نہ ہوا کہ اس کو سنتے ہی تم نے کہہ دیا ہوتا کہ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں!
معاذ اللہ یہ تو ایک بہت بڑا بہتان ہے [8] ○ 16
اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو ایسی بات تم سے پھر کبھی صادر نہ ہو○ اور اللہ
تمہارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کیے دے رہا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے○ 18
بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو' ان کے لیے دنیا اور آخرت
میں ایک دردناک عذاب ہے [9] اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو○ اور اگر تم پر اللہ کا فضل
اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور اللہ رؤف و رحیم نہ ہوتا تو تم ایک آفت میں پھنس جاتے○ 20
اے لوگو جو ایمان لائے ہو' شیطان کے نقوش قدم کی پیروی نہ کرو۔ اور جو شیطان کے نقوش قدم
کی پیروی کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ شیطان ہمیشہ بے حیائی اور برائی کی راہ سجھاتا ہے اور اگر اللہ کا فضل
اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا۔ بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک
کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ سمیع و علیم ہے○ 21
اور جو تم میں صاحب فضل اور کشادہ حال ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ قرابت مندوں'
مسکینوں اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہ کریں گے۔ بلکہ عفو و درگذر سے کام لیں[10]۔
کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخشے؟ اور اللہ غفور رحیم ہے○ 22
بے شک جو لوگ پاک دامن' بھولی بھالی' باایمان عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت

میں لعنت ہوئی اور ان کے لیے ایک بڑا عذاب ہے ○ اس دن جس دن ان کی زبانیں' ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے سامنے ان کے اعمال کی گواہی دیں گے (11)○ اس دن اللہ ان کا واجبی بدلہ پورا کر دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق اور واضح کر دینے والا ہے○ 25

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہوں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہوں گی اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ یہ لوگ بری ہوں گے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں(12)۔ ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے○ 26

اے ایمان والو' اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تعارف نہ پیدا کر لو اور گھر والوں کو سلام نہ کر لو(13)۔ یہی طریقہ تمہارے لیے موجب خیر و برکت ہے تاکہ تمہیں یاد دہانی حاصل رہے○ پس اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تمہیں اجازت نہ ملے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی طریقہ تمہارے لیے پاکیزہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے○ اور ان غیر رہائشی مکانوں میں داخل ہونے میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں جن میں تمہارے لیے کوئی منفعت ہے(14) اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو○ 29

مومنوں کو ہدایت کرو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی سپردہ پوشی کریں۔ یہ طریقہ ان کے لیے پاکیزہ ہے (15)۔ بے شک اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں○ اور مومنہ عورتوں کو کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں مگر جو ناگزیر طور پر ظاہر ہو جائے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بکل مار لیا کریں (16) اور اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کے سامنے یا اپنے باپوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے سامنے یا اپنے بیٹوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے تعلق کی عورتوں کے سامنے یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا ایسے زیر کفالت مردوں کے سامنے جو عورت کی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں (17) یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی عورتوں کی پس پردہ چیزوں سے آشنا نہ ہوں۔ اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو اور اے ایمان والو! سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ○ 31

اور اپنی رانڈوں اور رنڈوؤں اور ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرو۔ اگر وہ تنگ دست ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے ○ اور جو لوگ نکاح کرنے کی مقدرت نہیں پا رہے وہ اپنے آپ کو ضبط میں رکھیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے (18)○ اور جو مکاتب ہونے کے طالب ہوں تمہارے مملوکوں میں سے تو ان کو مکاتب بنا دو اگر تم ان میں صلاحیت پاؤ۔ اور ان کو اس مال میں سے دو جو خدا نے تم کو دیا ہے (19) اور اپنی لونڈیوں کو پیشہ پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ عفت کی زندگی کی خواہاں ہیں' محض اس لیے کہ کچھ متاع دنیا تمہیں حاصل ہو جائے۔ اور جو ان کو مجبور کرے گا تو اس اکراہ کے بعد اللہ ان کے لیے غفور رحیم ہے○ اور بے شک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں بھی اتار دی ہیں' اور ان لوگوں کی تمثیل بھی سنا دی ہے جو تم سے پہلے گزرے اور خدا ترسوں کے لیے موعظت بھی○ 34

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ (21) دل کے اندر اس کے نور ایمان کی تمثیل یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ ہو' چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو' شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔ چراغ ایک ایسے شاداب درخت زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی! اللہ اپنے نور کی ہدایت جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور اللہ یہ تمثیلیں لوگوں کی رہنمائی کے لیے بیان فرماتا ہے (22 اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے○ یہ طاق ایسے گھروں میں ہیں جن کی نسبت خدا نے امر فرمایا کہ وہ تعمیر کیے جائیں اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے۔ ان میں ایسے لوگ صبح و شام خدا کی تسبیح کرتے ہیں○ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کی یاد' نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتے۔ وہ ایک ایسے دن کی آمد سے اندیشہ ناک رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں سب مضطرب ہوں گے (22)○ کہ اللہ ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے اور ان کو اپنے فضل سے مزید نوازے اور اللہ جس کو چاہے گا بے حساب بخشے گا○ 38

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے چٹیل صحرا میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی گمان کرے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا البتہ اس کے پاس اللہ کو پائے گا بس وہ اس کا حساب چکا دے گا (24) اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے○ یا یوں خیال کرو کہ جیسے ایک گہرے سمندر کے اندر تاریکیاں ہوں' موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو' اوپر سے

بادل چھائے ہوئے ہوں۔ تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہوں۔ اگر اپنا ہاتھ بھی نکالے تو اس کو بھی نہ دیکھ پائے اور جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں[25] ○ 40

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے بھی پروں کو پھیلائے ہوئے۔ ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح معلوم ہے[26] اور اللہ باخبر ہے اس چیز سے جو وہ کر رہے ہیں ○ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہی کی طرف ہے سب کی واپسی ○ 42

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہانکتا ہے بادلوں کو، پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے، پھر ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔ پھر دیکھتے ہو کہ ان کے بیچ میں سے مینہ نکلتا ہے اور آسمان سے۔ اس کے اندر کے پہاڑوں سے۔ اولے برساتا ہے۔ پس جن پر چاہتا ہے ان کو نازل کرتا ہے اور جن سے چاہتا ہے ان کو ہٹا دیتا ہے۔ اس کی بجلی کی کوند معلوم ہوتا ہے کہ نگاہوں کو اچک لے جائے گی ○ اللہ ہی ہے جو رات اور دن کو گردش دیتا ہے۔ بے شک ان چیزوں کے اندر اہل نظر کے لیے بڑا سامان عبرت ہے[27] ○ 44

اور اللہ نے پیدا کیا ہر جاندار کو پانی سے، تو ان میں سے بعض تو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور ان میں سے بعض دو پاؤں سے چلتے ہیں اور ان میں سے بعض چار پیروں پر چلتے ہیں۔ اللہ جو چاہے پیدا کر دیتا ہے[28]۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ○ 45

ہم نے واضح کر دینے والی آیات اتار دی ہیں اور اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے ○ 46

اور یہ دعوی کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی۔ پھر ان میں سے ایک گروہ پھر جاتا ہے اور یہ لوگ درحقیقت مومن نہیں ہیں ○ اور جب یہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ پہلوتہی کرتا ہے ○ اور اگر حق ان کو ملنے والا ہو تو اس کی طرف نہایت فرمانبردارانہ آتے ہیں[29] ○ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ ابھی شک میں پڑے ہوئے ہیں یا ان کو اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کریں گے۔ بلکہ یہ لوگ خود ہی ظالم ہیں ○ اہل ایمان کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی کسی باہمی نزاع کے فیصلہ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا اور درحقیقت یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں ○ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے اور جو اس سے ڈریں گے اور اس کے حدود کی پاس داری کریں گے، وہی لوگ

ہیں جو فائز المرام ہوں گے[30] ○ 52

اور انھوں نے پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر تم ان کو جہاد کا حکم دو گے تو وہ ضرور نکلیں گے۔ کہہ دو کہ قسمیں نہ کھاؤ۔ بس دستور کے مطابق اطاعت اصل چیز ہے! جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے ○ ان سے کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ رسول پر صرف وہ ذمہ داری ہے جو اس پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے[31] اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو راہ یاب ہو گے اور رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے ○ 54

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں[32] ○ 55

اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوۃ دیتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے ○ اور ان کافروں کی نسبت یہ گمان نہ کرو کہ یہ زمین میں ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بے شک نہایت ہی برا ٹھکانا ہے[33] ○ 57

اے ایمان والو! [34]تمہارے غلام اور لونڈیاں بھی اور تمہارے اندر کے وہ بھی، جو ابھی بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں، تین وقتوں میں اجازت لیا کریں۔ ایک نماز فجر سے پہلے، دوسرے دوپہر کو جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو، اور نماز عشاء کے بعد۔ یہ تین اوقات تمہاری بے پردگی کے ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ تم ایک دوسرے کے پاس آمد و شد رکھنے والے ہو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے ○ اور جب تم میں سے وہ جو بچے ہیں بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ بھی اسی طرح اجازت لیں جس طرح ان کے پہلوں نے اجازت لی[36]۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے ○ اور عورتوں میں سے بڑی بوڑھیاں، جو اب نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، اگر اپنے دوپٹے اتاریں تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں اور یہ بات کہ وہ بھی احتیاط کریں ان کے لیے بہتر ہے[37]

اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے○ 60

نہ نابینا پر کوئی تنگی ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی ہے اور نہ مریض پر کوئی تنگی ہے اور نہ خود تمہارے اوپر کوئی تنگی ہے اس بات میں کہ تم اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اپنے زیر تولیت کے گھروں سے یا اپنے دوستوں کے گھروں سے کھاؤ پیو' خواہ اکٹھے ہو کر یا الگ الگ۔ بس یہ بات ہے کہ گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو جو اللہ کی طرف سے ایک با برکت اور پاکیزہ دعا ہے۔(38)۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو○ 61

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اور جب کسی اجتماعی معاملہ کے لیے رسول کے پاس ہوتے ہیں تو اس وقت تک وہاں سے نہیں نکلتے جب تک اس سے اجازت نہ لے لیں۔ جو لوگ تم سے اجازت لے کر جاتے ہیں وہی اللہ اور رسول پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ تو جب وہ اپنی کسی ضرورت سے اجازت مانگیں تو تم ان میں سے جس کو چاہو اجازت دے دیا کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے○ 62

تم لوگ رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو(40)۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں سے اچھی طرح باخبر رہا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جایا کرتے رہے ہیں(41)۔ پس وہ لوگ جو اس کے حکم سے گریز کرتے رہے ہیں اس بات سے ڈریں کہ ان پر کوئی آزمائش آجائے یا ان کو ایک دردناک عذاب آ پکڑے○ آگاہ رہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم جس حال پر ہو اللہ اس سے اچھی طرح سے باخبر ہے اور جس دن یہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو جو کچھ انھوں نے کیا ہو گا وہ اس سے ان کو باخبر کرے گا اور اللہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے○ 64

حاشیہ سورہ نور

مضمون:

معاشرتی و سیاسی زندگی میں ایمان کے تقاضے اور وہ احکام و ہدایات جو اسلامی معاشرہ کو ایمان کے ان تقاضوں سے منور کرنے اور منافقی ایمان مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔

1- اس سورہ کے احکام و ہدایات کی حیثیت فرائض کی ہے اس لیے ان کے معاملہ میں سہل انگاری اور بے پروائی کو راہ نہ دی جائے۔ تنبیہات سے اشارہ آیات 10، 14، 17، 20، 34، 46، 58 کی طرف ہے جو یہ واضح کرتی ہیں کہ خاندان و معاشرہ اور حدود و تعزیرات کے یہ احکام پچھلی امتوں کے لیے مزید قدم ثابت ہوئے اس لیے یہ امت ان کی پابندی کا خاص اہتمام کرے۔

2- یہ سزا زنا کے ہر قسم کے مجرم مرد اور عورت کے لیے ہے۔ روایات میں رجم کی جو سزا بیان ہوئی ہے وہ ان زانیوں کے لیے ہے جو معاشرے کے عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائیں اور ان کا جرم ایک آفت کی شکل اختیار کر چکا ہو۔ ایسے مجرموں کی سرکوبی کے لیے رجم کی سزا سورہ مائدہ کی آیات 33 - 34 کے تحت دی جاتی ہے۔

3- یعنی زانیوں اور زانیات کے ساتھ ازدواجی رشتہ اہل ایمان کے لیے حرام ہے۔ زنا اسی طرح کی اخلاقی نجاست ہے جس طرح کی عقائدی نجاست شرک ہے۔

4- الزام سے مراد زنا کی تہمت ہے۔ اگر ایسے لوگ چار معتبر گواہ پیش نہ کر سکیں تو ان کو قذف کی یہ سزا دی جائے گی اور ان کو ہمیشہ کے لیے ساقط الشہادت قرار دے دیا جائے گا۔ اس امت کے افراد کا اصلی مرتبہ یہ ہے کہ وہ زمین پر اللہ کے گواہ ہیں۔ ساقط الشہادت قرار دیے جانے کے بعد گویا وہ اس مرتبہ سے معزول ہو جاتے ہیں۔

5- قسم کے ذریعے یہ فیصلہ اصطلاح میں لعان کہلاتا ہے۔ لعان کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد قاضی میاں اور بیوی کے درمیان تفریق کرا دے گا۔ اس آیت میں جس سزا کا حوالہ ہے وہ سو کوڑوں کی وہی سزا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔

6- ان احکام کے زمانہ نزول میں مسلمانوں کے اندر منافقین کی ریشہ دوانیوں کے باعث کئی کمزوریاں ظاہر ہوئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کمزوریوں پر سزا دینے کے بجائے اپنے فضل و رحمت سے معاشرتی اصلاح کے احکام و

ہدایات کے نزول کا سبب بنا لیا۔ یہ اس فضل و رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

7- افک جھوٹ' من گھڑت اور خلاف حقیقت بات کو کہتے ہیں۔ واقعہ افک سے اشارہ اس فتنہ کی طرف ہے جو غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر منافقین نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کو ختم کرنے کے لیے برپا کیا جب وہ قافلے کے پیچھے رہ گئیں۔ اس فتنہ کا بانی منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی تھا جس نے سنسنی پھیلا کر مسلمانوں کے ایک گروہ کو متاثر کر لیا۔

8- اسلامی معاشرے میں ہر مسلمان مرد و عورت کا یہ حق ہے کہ دوسرے افراد معاشرہ ان کے بارے میں حسن ظن رکھیں اور کوئی شخص ایسی کوئی بات' جو اس حسن ظن کو مجروح کرنے والی ہو' اس وقت تک باور نہ کرے جب تک وہ دلیل سے ثابت نہ ہو جائے۔

9- جاہلیت میں عربوں کا معاشرہ نہایت ناپاک معاشرہ بن چکا تھا۔ فتنہ پردازوں نے مسلمانوں کی اخلاقی برتری کی دھاک کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ تدبیر سوچی کہ اس کے اندر برائی اور بے حیائی کا چرچا پھیلایا جائے۔ واقعہ افک اسی سازش کی ایک کڑی تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے کامیاب نہ ہونے دیا۔

10- عفو و درگزر کی اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ کئی سادہ لوح غریب مسلمان منافقین کے پیدا کردہ فتنہ کی سنگینی کا اندازہ نہ کر پائے اور اس کے نقل و روایت میں ملوث ہو گئے۔ اندیشہ تھا کہ صاحب ثروت مسلمان جو ان کی مالی سرپرستی کرتے تھے اصل حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد ان کی اعانت سے دستکش نہ ہو جائیں۔

11- یعنی دنیا میں لوگ اپنی ان درپردہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں پر پردہ ڈال سکتے ہیں لیکن ان کی زبانوں اور ان کے ہاتھ پاؤں سے تو ان کی کوئی حرکت ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ انہی اعضاء سے گواہی دلوا دے گا کہ ان شریر لوگوں نے کیا کیا تہمتیں تراشیں اور کیا کیا فساد برپا کئے تھے۔

12- اس دنیا میں حالات پر بہت کچھ پردہ پڑا ہوا ہے اور نیک و بد رلے ملے ہوئے ہیں۔ آخرت میں جب جزائے حق کا دن آئے گا تو نفوس کی درجہ بندی ایمان و عقائد اور اعمال و اخلاق کے اعتبار سے ہوگی۔ اس دن اہل ایمان ان تمام خرافات اور بکواسوں سے بری اور پاک ہوں گے جو دنیا میں ان کے خلاف کی گئی ہوں گی۔

13- آگے کی ہدایات ان رخنوں کو بند کرنے کے لیے ہیں جو معاشرے میں بدنگاہی' تہمت اور اخلاقی مفاسد کو راہ دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس آزادی پر چند قیدیں عائد کی ہیں جو زمانہ جاہلیت کی سوسائٹی میں دوسروں کے گھروں میں آنے جانے کے معاملے میں لوگوں کو حاصل تھی۔ دوسروں کے گھروں میں داخلہ

کے لیے گھر والوں کے لیے متعارف و مانوس ہونے اور داخلہ کے وقت دروازے پر کھڑے ہو کر طلب اذن کو ضروری قرار دیا ہے۔ سلام کرنا طلب اذن کے لیے ہے۔

14- غیر رہائشی مکانوں میں دکانیں' ہوٹل' دفاتر وغیرہ شامل ہیں۔ مردانہ نشست گاہیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔

15- یعنی صاحب خانہ کے اعزہ و اقربا اور تعلق و اعتماد کے لوگوں کو جب گھروں میں داخلہ کی اجازت ملے تو ان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ گھر کی عورتوں سے اپنی نظر بچائے رکھیں اور باقرینہ لباس اختیار کریں اور یہی ہدایت گھر کی عورتوں کے لیے بھی ہے۔

16- یہ گھر کے اندر کا پردہ ہے۔ زینت کی چیزوں میں لباس بھی داخل ہے اور زیورات بھی۔ اس زینت کو چھپانے کا حکم ہوا جس کے چھپانے میں زیادہ زحمت نہیں ہے۔ نیز گھر کی عورتوں کو پابند کیا کہ غیر محرموں کی موجودگی میں دوپٹہ یا اوڑھنی سے اپنے سر اوڑھ کر کے ساتھ ساتھ اپنے گریبانوں کو بھی چھپائیں۔

17- اجنبی عورتوں کے سامنے بھی زینت کا اظہار منع کر دیا کیونکہ ایسا کرنا فتنہ اور خطرہ سے خالی نہیں ہوگا۔ مملوک سے مراد لونڈی' غلام ہیں۔ ملازموں کی صورت میں ان مذکورہ پابندیوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

18- یعنی بیوی سے محروم مردوں اور شوہر سے محروم عورتوں کے نکاح کرو اور نکاح کے لیے لوگوں کے اندر احساس پیدا کرو۔ اس کے مخالف رجحانات کی بیخ کنی کرو۔ جو لوگ غریب ہیں ان کی حوصلہ افزائی اور اعانت کرو تاکہ معاشرہ کے اندر اخلاقی مفاسد اور شیطان کی دراندازیوں کا سدباب ہو سکے۔ نکاح نہ ہونے کی صورت میں افراد اپنی اخلاقی ذمہ داری کو بہرحال پورا کریں۔

19- مکاتب اس غلام کو کہتے ہیں جو رقم یا کسی متعین خدمت کے عوض اپنے آقا سے آزادی حاصل کرنے کا خواہش مند ہو۔ ذی صلاحیت غلام کی اس خواہش کو پورا کرنے اور آزادی حاصل کرنے میں اس کی مالی اعانت کا حکم دیا گیا۔ اس حکم نے غلاموں کی آزادی کی راہ کھول دی۔

20- یعنی وہ تو یہ حرام پیشہ چھوڑ کر پاکدامنی کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں اور تم اپنے مفاد کی خاطر ان کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر رہے ہو۔ زمانہ جاہلیت میں بہت سے لوگ لونڈیوں سے پیشہ کرا کے اس کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس رسم بد پر یہاں پابندی لگا دی۔

21- آسمان اور زمین کا نور اللہ ہے۔ جس بندہ مومن کے پاس یہ نور ہے وہ روشنی میں اور صراط مستقیم پر ہے اور جو اس نور سے محروم ہے وہ ایک عالم ظلمات میں بھٹک رہا ہے' اس شخص کے لیے دنیا ایک اندھیر نگری ہے۔

22- قلب مومن کے اندر نور کی اس تمثیل سے واضح ہوتا ہے کہ ایسا دل حالات سے ڈانواں ڈول نہیں

ہوتا۔ یہ ان لوگوں کے سینوں کو اپنا نشیمن بناتا ہے جن کی فطرت فساد اور بگاڑ سے محفوظ ہو۔ ایمان کی روشنی فطرت کے نور کو دو بالا کرتی ہے اور بندہ مومن کا دل مطلع انوار بن جاتا ہے۔ جو لوگ فطرت کے روغن کو ضائع کر دیتے ہیں ان کے دل ایمان کی روشنی کو نہیں پکڑتے۔

23- یہ نور ایمان کے حامل لوگوں کی صفات کا ذکر ہے۔ انھیں دنیا کی کوئی چیز خدا سے غافل نہیں کرتی' انھیں ہر چیز سے زیادہ خدا کی رضا مطلوب ہوتی ہے۔

24- یہ اہل کفر کے اعمال کی تمثیل ہے۔ فرمایا کہ جب کفار کا سامنا قیامت کے دن اپنے اعمال سے ہوگا تو ان پر یہ راز کھلے گا کہ ان کے سارے اعمال راکھ کا ڈھیر ثابت ہوئے۔ وہ اپنے رب سے دوچار ہوں گے جو چشم زدن میں ان کا حساب چکا دے گا۔

25- یہ اہل کفر کی ذہنی تاریکی کی تمثیل ہے۔ خدا کو نہ مان کر وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں زندگی گزارتے ہیں اور دن پر دن اس کی تاریکی میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ ان کو روشنی صرف خدا پر ایمان سے حاصل ہو سکتی ہے۔

26- یعنی یہ ساری چیزیں زبان حال سے انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ بھی اس حمد و تسبیح میں ان کے ساتھ شامل ہو اور انھی کی طرح صرف اپنے رب ہی کی بندگی کرے۔

27- عبرت کے معنی ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا ہے۔ جو لوگ ان قدرتی مناظر کی حقیقت تک رسائی پاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کائنات میں سارا اختیار و اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہ بادلوں ہی کو اپنی رحمت کے نزول کا ذریعہ بناتا ہے اور انھی کے اندر سے نقمت کا سامان بھی پیدا کر لیتا ہے۔ وہ کائنات پر حاکم و متصرف ہے اس وجہ سے تنہا وہی حقدار ہے کہ اس کی عبادت و اطاعت کی جائے۔

28- یعنی انواع و اجناس اور اشکال و صور کا اختلاف و تعدد اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کائنات میں مختلف ارادے کارفرما ہیں بلکہ یہ دنیا کے خالق کی قدرت و حکمت کی دلیل ہے۔

29- ابتداءً اطراف مدینہ میں یہود بھی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ منافقین کی یہ روش تھی کہ اگر انھیں یہ اندازہ ہوتا کہ پیش نظر قضیہ میں اسلام کے قانون کا فیصلہ ان کے حق میں ہوگا تو وہ اپنا معاملہ نہایت فرمانبردارانہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لاتے اور اگر یہ اندازہ ہوتا کہ اسلام کا قانون ان کے مفاد کے خلاف ہے تو یہود کی عدالتوں میں لے جاتے جہاں انھیں حسب منشا فیصلہ حاصل کرنے کی توقع ہوتی۔

30- اس سے معلوم ہوا کہ نجات و فلاح کے لیے اول تو مجرد دعوائے ایمان کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بھی شرط لازم ہے۔ ثانیاً محض اطاعت بھی کافی نہیں ہے بلکہ اس اطاعت

کے ساتھ خدا کی خشیت اور تقویٰ بھی ہونا ضروری ہے۔

31- یعنی قسمیں زیادہ نہ کھاؤ۔ قسمیں عمل کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ اصل شے جو مطلوب ہے وہ اصول کے مطابق اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جھوٹی قسموں سے تم اللہ علام الغیوب کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

32- منافقین اسلام کے مستقبل کے متعلق شک میں مبتلا تھے۔ لہٰذا فرمایا کہ اہل ایمان سے اللہ کا وعدہ ہو چکا ہے کہ وہ ان کو ملک میں غلبہ عطا فرمائے گا۔ یہاں اللہ کے دین کا قانون چلے گا اور اسی کی اساسات پر ملک کا نظام اجتماعی و سیاسی استوار ہوگا اور کسی کی مجال نہ ہوگی کہ وہ اللہ کے دین یا اس دین کے حاملوں کے لیے کوئی خطرہ پیدا کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ فتح مکہ کے بعد پورا ہوا۔

33- یہ دلوں کو نفاق' شک اور خوف کے امراض سے پاک رکھنے کے لیے علاج تجویز کیا ہے کہ نماز کا اہتمام کرو' زکوٰۃ ادا کرو اور رسول کی بے چون و چرا اطاعت کرو۔

34- یہاں سے آگے خاتمہ سورہ کی آیات میں اوپر دیے گئے احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔

35- اوپر گھروں میں داخلہ کے لیے اجازت لینے کی جو پابندی لگائی تھی غلاموں اور نابالغ بچوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا تھا۔ یہاں بے تکلفی اور بے پردگی کے تین اوقات میں ان کو بھی اجازت لینے کا پابند کر دیا ہے۔

36- یعنی اس دلیل کی بنا پر کہ یہ بچپن سے گھر آتے جاتے رہے ہیں ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

37- بڑی بوڑھیوں کے ساتھ یہ رعایت ان کی آسانی کے لیے کی گئی ہے۔ چونکہ بعض عورتوں میں یہ کمزوری ہوتی ہے کہ بوڑھی ہو جاتی ہیں لیکن زیورات اور اپنی ثروت کی نمائش کا شوق ان کے اندر سے نہیں نکلتا اس لیے متنبہ کر دیا کہ وہ اس رخصت سے کوئی غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔

38- دور جاہلیت میں چونکہ غیر محدود آزادی لوگوں کو حاصل رہی تھی اس لیے انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام سوشل آزادیوں کو محدود کرنا چاہتا ہے۔ لوگوں کے اس شبہ کو دور کرنے لیے یہ وضاحت فرما دی کہ ان پابندیوں سے نہ یہ مقصود ہے کہ اندھے' لنگڑے اور مریض اپنے تعلق کے لوگوں کے سہارے سے محروم ہو جائیں اور نہ یہ مطلب ہے کہ اعزہ و اقربا اور دوستوں کے ساتھ معاشرتی روابط منقطع ہو جائیں۔ لوگ ایک دوسرے کے ہاں آئیں جائیں' ملیں جلیں' کھائیں پئیں' انفرادی طور پر بھی اور تقریبات میں اجتماعی طور بھی۔ بس مبارک اور پاکیزہ طریقہ سلام کی پابندی کو گراں نہ سمجھیں کیونکہ اس میں انھی کی فلاح و بہبود مد نظر ہے۔

39- یعنی ہر چند اس طرح کی اجازت مانگنا کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے اس لیے کہ رسول کی معیت و نصرت سے بڑھ کر' بالخصوص جب کوئی اجتماعی ضرورت درپیش ہو' کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا' لیکن انسانی کمزوریوں کے

پیش نظر رسول اللہ کو اجازت دے دی گئی کہ وہ کسی کو اجازت دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔

40۔ یعنی اللہ کا رسول جب کسی اجتماعی کام کے لیے تمھیں بلائے تو اس کے بلانے کو کسی عام شخص کا بلانا نہ سمجھو کہ جی چاہا گئے' جی چاہا نہ گئے۔ اور گئے بھی تو جب جی چاہا اٹھ کر چل دیے۔ بلکہ ضرور جایا کرو اور جب تک اجازت نہ ملے اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھو۔

41۔ یہ منافقین کو تنبیہ ہے کہ اللہ ان لوگوں سے برابر آگاہ رہا ہے جو رسول کے بلائے ہوئے اجتماعات سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے رہے ہیں کہ پرسش ہو تو عذر کر سکیں کہ ان کو حضور کے حکم کی خبر نہیں ہوئی۔

تدبر حدیث

امین احسن اصلاحی

اسلامی آداب
(موطا امام مالک کی کتاب الجامع کی روایات)
ماجاء فی اسبال المراہ ثوبہا
عورت کے کپڑا لٹکانے کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن ابی بکر بن نافع عن ابیہ نافع مولی ابن عمر عن صفیہ بنت ابی عبید انہا اخبرتہ عن ام سلمہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہا قالت حین ذکر الازار فالمراہ یا رسول اللہ؟ قال ترخیہ شبرا قالت ام سلمہ اذن یکشف عنہا؟ قال فذراعا لا تزید علیہ۔

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ام سلمہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب ان کے سامنے تہمد کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ پھر عورت کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا ایک بالشت کے قریب لٹکا لے۔ ام سلمہؓ نے کہا کہ تب اس کے جسم کا کچھ حصہ (پاؤں) تو کھلا رہے گا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ہاتھ سہی' اس سے زیادہ نہیں کر سکتی۔

وضاحت۔ اسبال ازار یعنی تہمد لٹکانے کے معاملہ کا تعلق اصلاً مردوں' اور وہ بھی متکبر لوگوں سے ہے' عورتوں سے نہیں۔ حضرت ام سلمہؓ نے جب سنا کہ مردوں کو اسبال ازار سے منع کیا گیا ہے تو انہوں نے پوچھا کہ عورتوں کے لیے کیا حکم ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ عورتیں اپنا ازار یا تہمد پنڈلی کے نصف سے ایک بالشت نیچے تک لٹکا سکتی ہیں۔ اگر اس سے پاؤں کھلتے ہوں تو بالشت کی بجائے زیادہ سے زیادہ ایک ہاتھ نیچے کر لیں۔ اس سے زیادہ نیچے نہ کریں۔

ماجاء فی الانتعال

جوتا پہننے کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا یمشین احدکم فی نعل واحدۃ لینعلھما جمیعا او لیحفھما جمیعا۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص ایک جوتی پہن کر نہ چلے۔ یا تو دونوں پاؤں میں جوتا پہنے یا دونوں سے اتار دے۔

وضاحت: ایک پاؤں میں جوتا پہننا ایک احمقانہ حرکت ہے۔ آدمی کو جوتے دونوں پاؤں میں پہننے چاہیں یا پھر دونوں میں نہ پہنے۔ ہاں اگر کسی کا ایک ہی پاؤں ہے یا کسی مجلس میں ایک جوتا گم ہوگیا تو مجبوری ہے۔ حدیث کا اطلاق اس صورت پر نہیں۔

حدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا انتعل احدکم فلیبدا بالیمین، واذا نزع فلیبدا بالشمال، ولتکن الیمنی اولھما تنعل واخرھما تنزع۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی جوتا پہنے تو چاہیے کہ وہ دہنے پاؤں سے شروع کرے اور اتارے تو بائیں سے شروع کرے۔ داہنا پاؤں جوتا پہننے میں پہلا اور اتارنے میں آخری ہو۔

وضاحت: یہ بات اسلامی آداب میں سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چیز میں اپنی امت کی تربیت بڑی تفصیل سے کی ہے۔ حتیٰ کہ یہاں جوتا پہننے اور اتارنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

حدثنی عن مالک عن عمہ ابی سہیل بن مالک عن ابیہ عن کعب الاحبار ان رجلا نزع نعلیہ، فقال لم خلعت نعلیک؟ لعلک تاولت ھذہ الایہ فاخلع نعلیک انک بالوادی المقدس طوی۔ قال ثم قال کعب للرجل۔ اتدری ما کانت نعلا موسی؟ قال مالک لا ادری ما اجابہ الرجل، فقال کعب کانتا من جلد حمار میتہ۔

ترجمہ: کعب احبار سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی موقع پر اپنے دونوں جوتے اتارے۔ انھوں

نے پوچھا کہ تم نے جوتے کیوں اتارے؟ شاید تم نے یہ کام اس آیت کی تاویل میں کیا ہے فاخلع نعلیک انک بالوادی مقدس طوی (اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم وادی مقدس طویٰ میں ہو)۔ پھر کعب نے اس شخص سے کہا۔ کیا تم جانتے ہو کہ حضرت موسیٰ کے جوتے کس چیز کے بنے ہوئے تھے؟ مالک کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ اس شخص نے کیا جواب دیا۔ کعب نے کہا کہ وہ مردہ گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے۔

وضاحت: معلوم ہوتا ہے آدمی نے جوتے کسی ایسے مقام پر اتار دیے جہاں ان کے اتارنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس پر کعب احبارؓ نے اعتراض کیا کہ معلوم ہوتا ہے تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے اس حکم کی روشنی میں ایسا کیا ہے جس میں انہیں کوہ طور کی وادی طویٰ میں جوتے اتارنے کو کہا گیا تھا۔ پھر انھوں نے بتایا کہ موسیٰ کو جن جوتوں کے اتارنے کا حکم ہوا وہ مردہ گدھے کی کھال سے بنائے گئے تھے۔ کعبؓ یہودی عالم تھے۔ ان کی ساری معلومات اسرائیلیات میں سے تھیں۔ جب اسلام میں آئے تو ان کو جب شوق ہوتا اور موقع ملتا تو اسرائیلی روایات بیان کرتے تھے۔ کعبؓ کی یہ روایت بھی اسرائیلیات کی ایک مثال ہے۔ ورنہ قرآن مجید نے جوتے اتارنے کا یہ سبب بیان نہیں کیا۔

ماجاء فی لبس الثیاب

کپڑوں کے پہننے کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرہ انہ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن لبستین، و عن بیعتین عن الملامسۃ، و عن المنابذہ و عن ان یحتبی الرجل فی ثوب واحد لیس علی فرجہ منہ شئی و عن ان یشتمل الرجل بالثوب الواحد علی احد شقیہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قسم کے لباسوں اور دو طرح کے سودوں سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے ملامست اور منابذت سے منع فرمایا ہے، نیز اس بات سے کہ آدمی کمر اور ٹانگوں کو ایک ہی کپڑے میں اس طرح باندھے کہ اس کی شرمگاہ پر کوئی چیز نہ ہو، اور اس بات سے کہ آدمی اپنی چادر کو اس طرح لپیٹے کہ وہ ایک ہی پہلو پر آئے اور دوسرے پر کچھ نہ ہو۔

وضاحت: لوگوں نے جوئے کی کئی شکلوں کو رواج دیا ہے۔ جس طرح آج ریفل اور لاٹری وغیرہ کی

شکلیں رائج ہیں اسی طرح زمانہ جاہلیت میں تاجر مال کو دکھائے بغیر جوئے کا سودا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ملامست بیع کی وہ شکل تھی جس میں خریدار مال کو دیکھے بغیر جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتا اس کی بیع ہو جاتی۔ منابذت میں کوئی چیز پھینکی جاتی تو وہ جس مال کو لگ جاتی' خریدار کے لیے اس کو لینا لازم ہوتا۔ خریدنے والے کو دیکھنے کا اختیار نہیں تھا۔ ایسے سودوں میں فریب' زیادتی اور خطرے کے عناصر شامل ہوتے ہیں' لہٰذا ان سے حضور نے منع فرمایا ہے۔

جن دو لباسوں سے حضور نے منع فرمایا ان کو احتباء اور اشتمال سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارے دیہات میں لوگ جب مل بیٹھتے ہیں تو اپنی رانوں کو پیٹ کے ساتھ لگا کر ایک چادر سے ٹانگوں اور کمر کو باندھ لیتے ہیں۔ یہ نشست آرام دہ ہو جاتی ہے۔ اسی کو احتباء کہتے ہیں۔ اشتمال سے مراد جسم کو ایک ہی کپڑے سے اس طرح لپیٹ لینا ہے کہ بازو بھی اس میں سے نہ نکالے جا سکیں۔ ہمارے ہاں پاجامہ یا شلوار پہنی جاتی ہے لیکن عربوں کا لباس ایک لمبی قمیض پر مشتمل ہوتا ہے جس کے نیچے کبھی پاجامہ یا جانگیہ پہنا جاتا اور کبھی غریب لوگ محض قمیض یا سادہ چادر کو کافی سمجھتے۔ آخری شکل میں احتباء اور اشتمال کی صورتوں میں ستر کھل جانے کا امکان ہوتا۔ لہٰذا اس خدشہ کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اوڑھنے کی ان شکلوں کو منع فرمایا۔

حدثنی عن مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمران عمر بن الخطاب رای حلہ سیراء تباع عند باب المسجد' فقال یا رسول اللہ لو اشتریت ھذہ الحلہ فلبستھا یوم الجمعہ وللوفد اذا قدموا علیک' فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما یلبس ھذہ من لاخلاق لہ فی الاخرۃ' ثم جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھا حلل فاعطی عمر بن الخطاب منھا حلۃ' فقال عمر یا رسول اللہ اکسوتنیھا وقد قلت فی حلۃ عطارد ماقلت' فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم اکسکھا لتلبسھا فکساھا عمر اخالہ مشرکا بمکۃ۔

ترجمہ :۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک ریشمی سوٹ دیکھا کہ مسجد کے دروازے پر بک رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! اگر آپ اس کو خرید لیتے تو جمعہ کو بھی پہن لیتے اور وفود کے لیے بھی جب وہ آتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو تو وہ لوگ پہنتے ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں

سے ایسے سوٹ آئے تو آپ نے حضرت عمرؓ کو بھی ایک سوٹ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ نے میرے پہننے کے لیے سوٹ بھیجا حالانکہ آپ نے عطارد کے سوٹ کے بارے میں جو کہا وہ کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمہارے پہننے کے لیے نہیں دیا۔ تو حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مشرک بھائی کے پہننے کے لیے مکہ بھیج دیا۔

وضاحت :۔ حلہ کہتے ہیں ایک چادر اور ایک تہمد کو یا قمیض اور تہمد کو۔ یہ وہی عمر بن خطاب ہیں جن کے اپنے کپڑوں میں پیوند لگے رہتے تھے۔ لیکن اس وقت ابھی اس طرح کا جذبہ باقی تھا۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت عمرؓ کا کوئی بھائی تھا یا نہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب حضرت عمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بات یاد دلائی تو آپ نے وضاحت کر دی کہ تم اسے کسی اور کے کام میں لاؤ۔ مثلاً وہ اپنی بیوی کو دے سکتے تھے یا کسی اور کو تحفہ دے سکتے تھے۔ تو انہوں نے اپنے مشرک بھائی کو بھیج دیا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک دنیاوی معاملات کا تعلق ہے مسلمان اپنے کافر یا مشرک بھائیوں کا بھی خیال رکھتے تھے' اس لیے کہ یہ الگ ایک خیر کا کام ہے۔

حدثنی عن مالک عن اسحق ابن عبداللہ بن ابی طلحہ انہ قال قال انس بن مالک رائیت عمر بن الخطاب وھو یومئذ امیر المدینہ وقد رقع بین کتفیہ برقاع ثلاث لبد بعضھا فوق بعض۔

ترجمہ :۔ انس بن مالک سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب کو دیکھا' اور وہ اس زمانے میں مدینہ کے امیر تھے کہ انہوں نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان تین پیوند ایک دوسرے کے اوپر چپکائے ہوئے تھے۔

وضاحت :۔ ایک وہ عمر ہیں جو رسول اللہ کو ریشمی سوٹ خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں اور ایک یہ کہ اپنی قمیص کو تین تین پیوند لگائے ہوئے ہیں۔ امیر مدینہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلیفہ بننے کے بعد کی بات ہے۔ حضرت عمرؓ بیت المال سے اپنے اوپر کم سے کم خرچ کرتے تھے تاکہ غرباء کی ضروریات پوری ہو سکیں' نیز یہ چیز اپنے دوسرے امراء اور بعد کے لوگوں کے لیے نمونہ ہو۔ یوں بھی خلفائے راشدین اپنا معیار زندگی عوام الناس سے زیادہ بلند نہیں کرتے تھے تاکہ لوگوں کے درمیان معیار بلند کرنے کے مقابلہ کی خواہش نہ پیدا ہو جائے۔

ماجاء فی صفه النبی صلی الله علیه وسلم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن ربیعه بن ابی عبدالرحمن عن انس بن مالک انه سمعه یقول کان رسول الله صلی الله علیه وسلم لیس بالطویل البائن ولا بالقصیر ولا بالابیض الامهق ولا بالادم ولا بالجعد القطط ولا بالسبط بعثه الله علی راس اربعین سنه فاقام بمکه عشر سنین وبالمدینه عشر سنین وتوفاه الله عز و جل علی راس ستین سنه و لیس فی راسه و لحیته عشرون شعره بیضاء صلی الله علیه وسلم وعلیه السلام ورحمه الله و برکاته۔

ترجمہ:۔ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالک سے سنا۔ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو بہت لمبے تھے' نہ پستہ قد تھے' نہ بالکل چٹے سفید تھے اور نہ زیادہ گندم گوں۔ نہ آپ کے بال بالکل گھنگریالے تھے اور نہ بالکل سپاٹ۔ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔ آپ نے مکے میں دس سال قیام کیا اور مدینہ میں دس سال اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساٹھ سال کے خاتمے پر وفات دی جب آپ کے سر یا داڑھی میں بیس بال بھی سفید نہیں تھے۔

وضاحت:۔جہاں تعریف کرنا مشکل ہو رہا ہو وہاں نفی و اثبات دونوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ طویل البائن یعنی حضور بڑے لمبے تڑنگے نہ تھے اور نہ ہی پستہ قد تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ درمیانہ قد تھے۔ اسی طرح آپ کا رنگ نہ بالکل سفید اور نہ ہی ایسا جو مائل بہ سیاہی ہو بلکہ سفیدی مائل گندمی تھا۔ بال بھی نہ بہت پر شکن تھے اور نہ ہی بالکل سپاٹ جیسے معلوم ہو کہ پٹ سن کو دھو کر کسی چیز پر لٹکا دیا ہے کہ اس میں نہ کوئی شکن ہے نہ گرہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ مکے کے تیرہ سال شمار کرتے ہیں جبکہ اس روایت میں دس سال شمار کیے گئے ہیں۔ باقی رہ گیا یہ سوال کہ نبوت کے لیے چالیس سال کی عمر متعین ہے تو اس مفروضہ کی کوئی بنیاد نہیں۔ عمر اس سے کم و بیش بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ان کو اس سے کم عمر میں نبوت ملی۔ لہٰذا اس سوال کو

بہت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔

ماجاء فی صفه عیسی ابن مریم علیه السلام والدجال

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجال کے حلیہ کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن نافع عن عبدالله بن عمر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ارانی اللیله عند الکعبه فرایت رجلا آدم کا حسن ما انت راء من ادم الرجال له لمه کا حسن ما انت راء من اللمم قد رجلها فهی تقطر ماء متکئا علی رجلین' او علی عواتق رجلین یطوف بالکعبه فسالت من هذا؟ قیل هذا المسیح ابن مریم' ثم اذا انا برجل جعد قطط اعور العین الیمنی کانها عنبه طافیه فسالت من هذا؟ فقیل لی هذا المسیح الدجال۔

ترجمہ:۔عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں رات میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں کعبہ کے پاس ہوں۔ پھر ایک گندمی رنگ کے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا رنگ گندمی لوگوں کے رنگ میں سے سب سے خوبصورت ہے۔ اس کی زلفیں بہترین ہیں جو کوئی دیکھنے والا دیکھ سکتا ہو۔ ان میں وہ کنگھا کیے ہوئے ہے اور ان میں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ وہ دو آدمیوں پر ٹیک لگائے یا دو آدمیوں کے کندھوں کا سہارا لیے ہوئے کعبہ کا طواف کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون حضرت ہیں؟ تو جواب ملا کہ یہ عیسیٰ ابن مریم ہیں۔ پھر ناگاہ میری نظر ایک شخص پر پڑی جس کے بال حبشیوں کی طرح پر شکن تھے۔ اس کی داہنی آنکھ اندھی تھی اور ابھری ہوئی جیسے گول انگور کا دانہ۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے تو جواب ملا کہ یہ مسیح دجال ہے۔

وضاحت:۔اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک رویا کا ذکر ہے جس میں آپ نے دو اشخاص کو دیکھا۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام کو بیت اللہ کا طواف کرتے اور دوسرا دجال کو۔ حضرت عیسیٰؑ کے اس حلیہ کی تائید انجیلوں سے بھی ہوتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سیدنا مسیح کی زلفیں اس طرح کی نہیں تھیں جیسے سردی کے بے رونق اور خشک یا پراگندہ بال ہوتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ابھی نہا کر نکلے ہیں اور ابھی تیل لگا کے کنگھا کیا ہے یا یوں معلوم ہوتا تھا کہ تیل ٹپک رہا ہے۔

جعد قطط کا مطلب یہ ہے کہ بہت ہی گھنگریالے بالوں والا شخص۔ حبشی لوگوں کے بال اس طرح

کے ہوتے ہیں۔ وہ ان میں انگوٹھیاں بھی لٹکا لیتے ہیں اور نہایت ہی بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ دجال کے متعلق روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔ اس بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ مدینہ کے ایک شخص ابن صیاد کے متعلق آنحضرت کو شبہ ہوتا تھا کہ یہ وہی دجال نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں اس کو قتل نہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ واقعی دجال ہوگا تو تم اس پر قابو نہیں پاؤ گے اور اگر وہ نہیں ہے تو کسی کی جان لینے سے کیا فائدہ؟ بہرحال یہ ایک شخصیت ہے جس کے آنے کی روایت مشہور ہے لیکن وہ اب تک آئی نہیں۔ اگر آئی ہوتی تو پکڑی گئی ہوتی کیونکہ اتنی واضح علامات کے ہوتے ہوئے وہ چھپ تو نہیں سکتی۔ ایسی شخصیت سے ' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آئے گی' ابھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب آئے گی دیکھا جائے گا۔ اسکا انکار کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

حدیث کی کتابوں میں دجال اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر بالعموم ایک ساتھ آتا ہے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شخصیت کو اکثر مدعیوں نے استعمال کیا ہے۔ چونکہ آنجناب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دوبارہ ظاہر ہوں گے' تو جو مدعی اٹھتا ہے ان کا نام لیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دجال بھی آئے گا تو انہی کے پردے میں آئے گا اور کہے گا کہ میں مسیح موعود ہوں۔ لیکن کہاں حضرت عیسیٰ کی زلفیں اور ملائم اور چمکتے بال اور کہاں یہ ذات خبیث کہ جس کی آنکھ پھولی ہوئی اور بال حبشیوں جیسے ہوں گے۔

ماجاء فی السنہ الفطرہ

فطرت کی سنت کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن سعید بن ابی سعید المقبری عن ابیہ عن ابی ھریرہ قال: خمس من الفطرہ' تقلیم الاظفار' وقص الشارب' ونتف الابط' و حلق العانہ والاختتان۔

ترجمہ :۔حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ ناخن ترشوانا' مونچھوں کا منڈوانا' بغل کے بال اتارنا' ناف کے نیچے کے بال مونڈنا اور ختنہ کروانا۔

وضاحت :۔یہاں یہ روایت موقوف ہے لیکن اسے مرفوع بھی بیان کیا گیا ہے۔ فطرت سے مراد وہ تقاضے ہیں جو خیر و شر کے اس علم پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ہے اور پہلے سے موجود ہے۔ شریعت

اس کے علاوہ ہے اور یہ فطری نور کے اوپر ایک اور نور ہے۔ یعنی فطرت کے احکام قدیم ترین ہونے چاہئیں جو ازل سے چلے آ رہے ہوں۔ گویا فطرت کے کام حضرت آدم بھی کرتے رہے ہوں گے اور ان کی اولاد میں بھی وہ چیزیں رائج رہی ہوں گی۔ روایت میں بیان کردہ پانچ باتوں میں پہلی بات ناخن ترشوانا ہے۔ اچھی انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ناخن ترشوائے جائیں۔ ناخن بڑھانا درندوں کی صفت ہے۔ مونچھوں کا منڈوانا مالکیہ کے نزدیک یہ ہے کہ لبوں کے اوپر سے مونچھیں منڈوا دی جائیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ ان کو جب کوئی مہم پیش آتی تو اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے غور کرتے تھے۔ میرا دل کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایسا کرتے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مشکل پیش آتی ہے تو آدمی کمزور سا ہو جاتا ہے۔ اس کا چھوٹا پن ہو جاتا ہے۔ لیکن صاحب عزم مشکل سے نکلنے کے لیے سوچتا ہے کہ کیا راستہ اختیار کیا جائے تو وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایک مثالی صاحب عزم آدمی اور اسلامی تہذیب کے نمونہ کامل ہیں۔ اگر وہ مونچھیں رکھتے تھے تب قص شارب کے معنی یہ ہیں کہ لب کھلا ہونا چاہیے۔ اس سے اوپر رکھنے میں مضائقہ نہیں۔ مالکیہ کا مذہب میرے نزدیک ٹھیک ہے اور اہل حدیث اس معاملہ میں متشدد ہیں۔

بغل کے بال لینا اور ناف کے نیچے کے بال مونڈنا بھی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ بال بڑھ جائیں تو گھن آتی ہے۔

ختنہ بھی سنت فطرت میں سے ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ روایت نہایت عجیب سی ہے کہ انہوں نے اسی سال کی عمر میں ختنہ کرایا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب یہ حکم فطرت کے احکام سے ہے تو یہ بالکل شروع ہی سے انسانوں کے عمل میں رہا ہوگا۔ عیسائیوں میں ختنہ کا رواج نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پال کے پیچھے لگ کر اپنی شریعت ہی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ یہی حال ہندوؤں کا ہے۔

حدثنی عن مالک عن یحی بن سعید عن سعید بن المسیب انہ قال: کان ابراہیم اول الناس ضیف الضیف و اول الناس اختتن و اول الناس قص الشارب و اول الناس رای الشیب فقال یا رب ما ھذا؟ فقال اللہ تبارک و تعالی و قار یا ابراھیم' فقال یا رب زدنی و قارا۔

ترجمہ :۔سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص تھے جنہوں نے مہمانوں کی

میزبانی کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ختنہ کیا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مونچھیں ترشوائیں اور وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بڑھاپے کے سفید بال دیکھے۔ اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا یا رب یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے رب میرے وقار میں اضافہ کر۔

وضاحت:۔ یہ ایک تابعی کا قول ہے۔ بعض علماء نے اس کو حضرت ابوہریرہؓ تک پہنچایا ہے لیکن بہرحال یہ مرفوع حدیث نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا مضمون پچھلی روایت سے ٹکراتا ہے۔ اس قول میں کچھ کاموں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولیت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو دیکھتے ہوئے اور بہت سے لوگوں نے کچھ مزید کاموں میں ان کی اولیت بتائی ہے اور اس فہرست کو طویل کر دیا ہے۔

ابن مسیب نے جن باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی اولیت بیان کی ہے ان میں پہلی چیز مہمان نوازی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سے پہلے کئی جلیل القدر پیغمبر گزرے تو کیا وہ مہمانوں کی میزبانی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی امتوں کو اس کی تعلیم نہیں دی تھی۔ اسی طرح جب ختنہ کروانا اور مونچھیں ترشوانا خصال فطرت میں سے ہے تو کیا حضرت ابراہیمؑ سے پہلے جو سلیم الفطرت لوگ گزرے کیا انہیں اس کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ پھر اگر حضرت ابراہیم پہلے شخص تھے جنہوں نے بڑھاپا دیکھا تو کیا حضرت نوح علیہ السلام جنہوں نے تقریباً ایک ہزار برس عمر پائی ان پر بڑھاپا طاری نہیں ہوا اور وہ جوان ہی رہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام کاموں میں سے کوئی کام ایسا نہیں جس کا حضرت ابراہیمؑ سے پہلے وجود ناممکن کہا جا سکتا ہو۔

ہو سکتا ہے ابن مسیب کے قول کا اصل مفہوم یہ ہو کہ جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور خاندان کا تعلق ہے ان کے اندر ابراہیمؑ سے قبل اعلیٰ خصال کی روایت نہیں تھی اور سیدنا ابراہیمؑ پہلے شخص تھے جنہوں نے ان پر عمل کیا۔ مثال کے طور پر ان سے پہلے انبیاء توحید کی دعوت دیتے رہے تھے لیکن جس طرح انہوں نے بتکدے میں اذان دی اس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ توجیہ اگر اس طرح کی جائے تو ابن مسیب کی بات کا ایک محل سمجھ میں آتا ہے ورنہ یہ روایت اوپر والی روایت کی نفی کرتی ہے۔

قال یحی و سمعت مالکا یقول: یوخذ من الشارب حتی یبدو طرف الشفہ وھوالاطار' ولا یخز فیمثل بنفسہ

ترجمہ:۔یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے میں نے سنا وہ کہتے تھے کہ مونچھوں میں سے اتنے بال لیے جائیں گے کہ آدمی کے ہونٹوں کے کنارے کھل جائیں اور اس کو اطار بھی کہتے ہیں۔ نیز مونچھوں کو اتنا نہ گھونٹ دیا جائے کہ آدمی اپنے آپ کا مثلہ کر لے۔

وضاحت:۔یہ امام مالک کا فتویٰ ہے اور مالکیہ کا عمل اسی پر ہے۔ گویا ان کے نزدیک مونچھیں اتنی تو ہونی چاہئیں کہ کسی مشکل کے وقت آدمی ان کا سہارا لے سکے اور حضرت عمرؓ کی طرح اپنی مونچھوں کو تاؤ دے سکے۔

النھی عن الاکل بالشمال
بائیں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن ابی الزبیر عن جابر بن عبداللہ السلمی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی ان یاکل الرجل بشمالہ او یمشی فی نعل واحدہ و ان یشتمل الصماء' و ان یحتبی فی ثوب واحد کاشفا عن فرجہ

ترجمہ:۔ جابر بن عبداللہ سلمی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی اپنے بائیں ہاتھ سے کھائے' یا ایک ہی پاؤں میں جوتا پہنے چلے' یا ایک ہی کپڑے میں اشتمال یا احتباء کرے جس سے اس کی شرمگاہ کے ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔

وضاحت:۔بائیں ہاتھ سے کھانے کی دو صورتیں مجبوری کی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کا ایک ہی ہاتھ ہو اور دوسری یہ کہ دائیں میں کوئی تکلیف ہو۔ ورنہ میرے نزدیک فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی صاف ستھرے کام ہیں وہ داہنے ہاتھ سے کیے جائیں اور جتنے کام دوسرے لگاؤ لپیٹ کے ہیں وہ بائیں ہاتھ سے کیے جائیں۔

ایک پاؤں میں جوتا پہننے کے متعلق بھی یہی ہے کہ اگر کسی کا ایک ہی پاؤں ہے اور وہ بیساکھی پر چلتا ہے تو اعتراض نہ ہوگا لیکن اگر کوئی فیشن بنانا چاہے تو یہ حماقت ہے۔

اشتمال اور احتباء کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس کے ممنوع ہونے کا ہمارے ہاں سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ شلوار یا پاجامہ کے ساتھ ستر نہیں کھلتا۔ البتہ دیہاتی لوگ اگر تہمد میں ہوں یا ایک چادر میں ہوں تو ان کے ستر کے کھل جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں احتیاط لازم ہوگی۔

حدثنی عن مالک عن ابن شہاب عن ابی بکر بن عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر عن عبداللہ بن عمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا اکل احدکم فلیاکل بیمینہ ولیشرب بیمینہ فان الشیطان یاکل بشمالہ و یشرب بشمالہ۔

ترجمہ :۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو چاہیے کہ داہنے ہاتھ سے کھائے اور پانی پیئے تو داہنے سے پیئے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے۔

وضاحت :۔احادیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شر' خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس کا منبع شیطان ہے۔ تو یہاں پر آنحضرتؐ نے بائیں ہاتھ سے کھانے کو اصل مرکز کی طرف منسوب کر دیا کہ یہ شیطانی طریقہ ہے۔ چونکہ محرک اول وہی ہوتا ہے تو یہ فعل بھی شیطان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مہذب آدمیوں کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔

ماجاء فی المساکین

مساکین کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لیس المسکین بھذالطواف الذی یطوف علی الناس فتردہ اللقمہ واللقمتان والتمرہ والتمرتان۔ قالوا فماالمسکین یا رسول اللہ؟ قال الذی لا یجد غنی یغنیہ' ولا یفطن الناس لہ فیتصدق علیہ' ولا یقوم فیسال الناس۔

ترجمہ :۔حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے آگے گردش کرتا ہے۔ کوئی اس کو ایک لقمہ دے دیتا ہے کوئی دو لقمے اور کوئی ایک کھجور دے دیتا ہے اور کوئی دو کھجوریں۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ پھر مسکین ہوا کون؟ آپ نے فرمایا کہ جو اتنے مال سے تو محروم ہے جو اس کو غنی کر دے' لیکن اس کے استغنا کے باعث لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ اس پر صدقہ کریں اور وہ خود نکلتا نہیں کہ لوگوں سے سوال کرے۔

وضاحت :۔یعنی ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا اور اس حال میں رہتا ہے کہ لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ آیا یہ مسکین ہے کہ اس کو کچھ دیا جائے۔ وہ بلند حوصلہ ہوتا

ہے جو یہ ذلت نہیں اٹھانا چاہتا کہ کوئی کہے کہ بھئی بابا معاف کرو۔

حدثنی عن مالک عن زید بن اسلم عن ابن بجید الانصاری ثم الحارثی عن جدتہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ردوالمسکین ولو بظلف محرق۔

ترجمہ :۔ابن بجید انصاری اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسکین کو اپنے دروازے سے لوٹاؤ اگرچہ ایک جلی ہوئی کھری ہی سے کیوں نہ ہو۔

وضاحت :۔مراد وہ کھری ہے جو ہنڈیا میں چڑھائی گئی تھی اور وہ جل گئی۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حقیر سے حقیر چیز ہی کیوں نہ میسر ہو مسکین کو کچھ دے دلا کر واپس کرنا چاہیے۔ ویسے ہی لوٹانا نہیں چاہیے۔

ماجاء فی معی الکافر

کافر کی آنتوں کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یاکل المسلم فی معی واحد والکافر یاکل فی سبعہ امعاء۔

ترجمہ :۔حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔

وضاحت :۔یہ روایت ظاہر کے خلاف ہے اس لیے اس کی توجیہ اگلی روایت کی روشنی میں کرنی چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راوی صاحب نے اس روایت سے اتنے ٹکڑے کو لے کر الگ روایت کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روایت اپنے موقع و محل سے کٹ گئی۔ اس وجہ سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

حدثنی عن مالک عن سہیل بن ابی صالح عن ابیہ عن ابی ھریرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضافہ ضیف کافر فامر لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشاہ فحلبت فشرب حلابہ ثم اخری فشربہ ثم اخری فشربہ حتی شرب حلاب سبع شیاہ ثم انہ اصبح فاسلم فامر لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشاہ فحلبت فشرب حلابہا ثم امر لہ باخری فلم یستتمہا' فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المومن یشرب فی معی واحد والکافر یشرب فی سبعہ امعاء۔

ترجمہ :۔ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک کافر مہمان ہوا۔ آنحضرتؐ نے ایک بکری اس کے لیے دوہنے کا حکم دیا۔ وہ دوہی گئی تو اس نے اس کا دودھ پیا۔ پھر دوسری دوہی گئی' وہ بھی پی گیا۔ پھر تیسری دوہی گئی وہ بھی پی گیا۔ یہاں تک کہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ صبح کو یہ آدمی مسلمان ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بکری دوہنے کا کہا۔ وہ دوہی گئی تو اس نے اس کا دودھ پی لیا۔ پھر آپ نے دوسری بکری کا کہا تو اس کے کچھ گھونٹ پی کر بس کر دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔

وضاحت :۔یہ ایک خاص واقعہ ہے اس میں مومن اور کافر کی طمع' خواہش اور حرص کا فرق نمایاں کیا ہے۔ مومن کے اندر صبر' قناعت اور غنا ہوتی ہے اور وہ تھوڑے پر کفایت کرلیتا ہے اور کافر کے اندر یہ بات ہوتی ہے کہ معلوم نہیں پھر ملے یا نہ ملے۔ ابھی سے بھرلو۔ یہ بات اس کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس طرح مومن کے ایمان کا کردار پر یہ اثر پڑتا ہے کہ اس میں قناعت اور صبراور اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے کہ جس نے اب دیا ہے وہ آئندہ بھی دے گا۔ کافر کی یہ سوچ نہیں ہوتی۔

اس روایت میں متعین طور پر یہ بتانا مقصود نہیں کہ سب کافر ایسے ہی ہوتے ہیں بلکہ تمثیل کے طور پر واضح کیا ہے۔ کتنے کافر ہیں جن کی خوراک کم ہوتی ہے۔ اسی طرح سے بہت سے مسلمان ہیں جو کافروں کا حصہ بھی کھا جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ کھانے پینے کے معاملہ میں ایک صاحب ایمان آدمی کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس روایت سے پچھلی روایت کا سقم واضح ہوگیا کیونکہ اس روایت کے آخری ٹکڑے کو الگ کرکے روایت کردی گئی۔ دونوں کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہی ہیں لیکن تا۔جی مختلف ہیں۔ جب آخری ٹکڑا اپنے موقع و محل سے کٹ گیا تو روایت ظاہر کے خلاف ہوگئی۔ البتہ اب بات ٹھیک ہوگئی۔

(ترتیب: سعید احمد)

مقالات

خالد مسعود

مواخات اور میثاق مدینہ

یثرب اور اس کے مضافات میں بسنے والے قبائل سے واقفیت اور حالات سے شناسائی حاصل کرنے کے بعد اور قریش کی جانب سے متوقع جنگی اقدامات کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو فیصلے کیے جو نہایت بروقت اور دور رس نتائج کے حامل تھے۔ پہلا فیصلہ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات یعنی بھائی چارا کا تعلق قائم کرنے کا تھا اور دوسرا مختلف قبائل کے حقوق اور ذمہ داریوں کے تعین کے لیے ایک تحریری معاہدہ کا' جسے عام طور پر "میثاق مدینہ" کا نام دیا جاتا ہے۔

مواخات

اس وقت تک یثرب کے دونوں قبیلوں' اوس اور خزرج' کے بکثرت گھرانے مسلمان ہوچکے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ ان کے سردار اور بااثر لوگ دین اسلام کے خادم کے طور پر نمایاں خدمات سر انجام دے رہے تھے۔ دوسری طرف مہاجرین کی ایک بڑی تعداد یثرب پہنچ چکی تھی۔ چونکہ ان کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اس لیے ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں باہمی حمایت و نصرت کی بنیاد خاندانی و قبائلی عصبیت پر تھی۔ مہاجرین اپنے خاندانوں سے کٹ چکے تھے اور نئے ماحول میں انھیں کوئی تحفظ حاصل نہ تھا۔ قرآن مجید نے اسلامی معاشرہ کو منظم کرنے کے لیے نئی اساسات فراہم کیں اور مہاجرین اور انصار کے درمیان ایمان' اسلام' اور ہجرت و جہاد کی بنیاد پر رشتہ ولایت قائم کیا۔ چنانچہ سورہ انفال: 72 میں فرمایا۔

ان الذین امنو وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللّٰہ والذین اووا و نصروا اولئک بعضھم اولیاء بعض۔

(وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی' یہی لوگ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں)

ان اساسات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کو ایک رشتہ میں جس طرح پرو دیا وہ

تاریخ انسانی کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے اور مواخات کے نام سے معروف ہے۔

اس دور کی بستیوں میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بڑی تعداد میں خالی مکانات میسر ہوں جن میں ہجرت کر کے آنے والوں کو اتارا جا سکے۔ ان لوگوں کو جو پہلے ہی بڑے دگرگوں حالات کا مقابلہ کر کے دین کی خاطر وطن چھوڑ کر چلے آئے تھے' ایک اجنبی ماحول میں بے یار و مددگار چھوڑنا کسی طرح مناسب نہ تھا لیکن وسائل کی کمی اس بات میں مانع تھی کہ فوراً" نئی بستیاں ان کے لیے تعمیر کر دی جائیں۔ لہٰذا مسئلہ کے حل کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر مہاجر کو کسی باحیثیت انصاری کا بھائی بنا دیا کہ وہ اس کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں مدد دے اور اس کی پشت پناہی کرے۔ قبائلی نظام میں یہ طریقہ اختیار کرنا بھی ممکن تھا کہ سردار قبیلہ کو مہاجرین کی ایک خاص تعداد کے قیام و طعام کا ذمہ دار بنا دیا جاتا اور وہ اپنی صوابدید پر جیسے چاہتا ان کے ساتھ معاملہ کرتا لیکن آنحضرت کا اختیار کردہ طریقہ بے مثال اور نہایت پر حکمت تھا۔ آپ نے مہاجرین کو اوس اور خزرج کی مختلف شاخوں میں پھیلا دیا۔ مواخات کی اس اسکیم کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے اکابر مہاجرین کے انصاری بھائیوں کی فہرست کافی ہے جو تاریخ نے محفوظ رکھی ہے۔

مہاجر۔ ابوبکر صدیق	انصاری۔ خارجہ بن زہیر	(خزرج۔ بنو حارث)
عمر بن الخطاب	عتبان بن مالک	(خزرج۔ بنو سالم)
عثمان بن عفان	اوس بن ثابت	(خزرج۔ بنو نجار)
ابوعبیدہ بن الجراح	سعد بن معاذ	(اوس۔ بنو عبدالاشہل)
زبیر بن العوام	سلمہ بن سلامہ	(اوس۔ بنو عبدالاشہل)
عبدالرحمٰن بن عوف	سعد بن الربیع	(خزرج۔ بنو حارث)
زید بن حارثہ	اسید بن حضیر	(اوس۔ بنو عبدالاشہل)
حمزہ بن عبدالمطلب	زید بن ثابت	(خزرج۔ بنو نجار)
مصعب بن عمیر	ابو ایوب	(خزرج۔ بنو نجار)
طلحہ بن عبیداللہ	کعب بن مالک	(خزرج۔ بنو سلمہ)
ابو حذیفہ بن عتبہ	عباد بن بشر	(اوس۔ بنو عبدالاشہل)

ابو ذر غفاری	منذر بن عمرو	(خزرج۔ بنو ساعدہ)
سلمان الفارسی	ابوالدرداء	(خزرج۔ بنو حارث)
حاطب بن ابی بلتعہ	عویمر بن ساعدہ	(خزرج۔ بنو عمرو بن عوف)

اہل تحقیق نے رجال کی کتابوں کی مدد سے پچاس یا اس سے بھی زیادہ مہاجرین کے انصاری بھائیوں کے نام جمع کر لیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نام اس سے کہیں زیادہ ہوں گے لیکن ان کا ریکارڈ نہیں رکھا گیا اور نہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت تھی۔ یہ کام ہجرت کے فوراً" بعد ہی نہیں ہوا بلکہ جوں جوں لوگ ہجرت کر کے آتے گئے ان کو اس وضع کردہ نظام سے متمتع ہونے کا موقع دیا گیا۔ چنانچہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کی مواخات حضرت حتات بن یزید سے اس وقت قائم کی گئی جب وہ صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ چونکہ ہجرت کا سلسلہ فتح مکہ پر موقوف ہو گیا لہٰذا مواخات کی آخری حد فتح مکہ ہی کو ماننا چاہیے۔

دین کی نصرت و حمایت کے اس کام میں انصار کس قدر دل و جان کے ساتھ شریک ہوئے اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے ساتھ اس وقت پیش آیا جب ان کو حضرت سعد بن الربیعؓ کے ہاں بھائی بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت سعدؓ نے پیش کش کی کہ میں اپنی جائیداد' زمین اور مال کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہوں۔ ایک حصہ میرا ہو گا دوسرا آپ کا۔ میری دو بیویاں ہیں ان میں سے جس کو آپ پسند کریں میں اس کو نکاح سے آزاد کر دوں گا اور آپ اس کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اس پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا کہ آپ کو اپنی ہر چیز مبارک ہو' آپ مجھے بازار لے چلیے۔ میں وہاں جا کر لے کر تجارت کروں گا اور آپ پر بار نہیں بنوں گا۔ چنانچہ سعدؓ ان کو بنو قینقاع کے بازار میں لے گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن نے قلیل مدت میں اپنا کاروبار قائم کر لیا اور اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہاجرین انصار پر خواہ مخواہ کا بوجھ ڈالنے والے نہیں بنے بلکہ انہوں نے محنت سے مدنی معاشرہ میں اپنا مقام بہت جلد بنا لیا۔ لیکن جہاں تک مواخات کا تعلق ہے تو یہ رابطہ زندگی بھر قائم رہا اور اسے بڑی اہمیت دی گئی۔ چنانچہ حضرت بلالؓ کے متعلق آتا ہے کہ عہد فاروقی میں حکومت سے ملنے والے وظیفہ کا اندراج انہوں نے اپنے اسلامی بھائی بنو خثعم کے ابو رویحہؓ کے ساتھ کرایا۔

انصار کی فیاضی' فراخ دلی اور سیر چشمی کی تعریف قرآن مجید نے بھی کی ہے اور اس طرح انصار کے

کردار کو رہتی دنیا تک ایک نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ فرمایا۔

والذین تبوء وا الدار و الایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ و من یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون (الحشر 9)

"اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں وہ ان لوگوں کو دوست رکھتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کی طرف آ رہے ہیں اور جو کچھ ان کو دیا جا رہا ہے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کر رہے ہیں۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں اگرچہ انہیں خود احتیاج ہو۔ اور جو خود غرضی سے محفوظ رکھے گئے تو درحقیقت وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انصار اتنے سیر چشم اور مہاجرین سے محبت کرنے والے تھے کہ ان کے دل اس بات سے تنگ نہیں ہوئے تھے کہ مہاجرین کی مدینہ کو ہجرت کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا ہے اور ہر نیا آنے والا ان کے مال میں شریک ہو رہا ہے۔ وہ ہر مہاجر کا خیر مقدم کرتے اور ان کی ضروریات پر اپنی ضرورتوں کو قربان کر دیتے۔ وہ حرص و طمع سے بالکل پاک اور اسلامی اخوت کے تقاضوں کو صدق دل سے پورا کرنے والے تھے۔ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پند و نصیحت ہمیشہ ان کے لیے مشعل راہ ہوتی جب آپ فرماتے۔

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا و کونوا عباداللہ اخوانا

(ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو' باہم حسد نہ کرو' ایک دوسرے سے منہ پھیرنے کی روش اختیار نہ کرو۔ اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کر رہو)

کوئی اچھا جذبہ بھی جب حد سے بڑھ جاتا ہے اور آدمی اعتدال کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اس پر قدغن لگا دی جائے۔ مواخات کے لیے انصار کے جذبات کا اندازہ اوپر بیان کردہ حضرت سعد بن الربیع کے قول سے لگایا جا سکتا ہے۔ علی ھذا القیاس معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس تعلق کو فوقیت دیتے ہوئے قرابتداروں کے حقوق کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ہمارے سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ انصار نے وراثت میں ان بھائیوں کے حق کو فائق سمجھا اور حقیقی اعزہ کو نظر انداز کرنے لگے۔ اس پر قرآن مجید میں یہ وضاحت نازل ہوئی۔

ولولوا الارحام بعضھم اولٰی ببعض فی کتاب اللہ (الانفال: 75)

"اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے سے زیادہ حق دار ہیں۔"

یعنی وراثت کا حق قرابتداروں ہی کا ہے نہ کہ اس طرح بننے والے اسلامی بھائیوں کا۔ لہٰذا اخوت و نصرت کا تعلق ان قوانین اور حقوق کو متاثر نہیں کرے گا جو رحمی رشتوں اور قرابت داری کی بنا پر قائم ہوتے ہیں اور جن کی تعلیم شریعت نے دی ہے۔ یہ ہدایت مفرط جذبات کو قابو میں اور حدود کے اندر رکھنے کے لیے تھی۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ اب مواخات کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مواخات عندالضرورت فتح مکہ تک ہوتی رہی۔

مواخات کی اسکیم میں کسی حد تک مہاجرین کی آباد کاری اور معاشی کفالت ملحوظ رہی ہو گی لیکن یہ اس کا مقصد وحید نہیں تھا۔ مہاجرین سب کے سب لٹے پٹے نہیں آئے تھے۔ اکثر و بیشتر کے مال و منال ان کے ساتھ تھے۔ انہیں وقتی سہارے کی ضرورت تو محسوس ہو سکتی تھی لیکن مستقل سہارے سے وہ بے نیاز تھے۔ یہ بات بھی ہے کہ یہ مسئلہ ایسا شدید ہوتا تو اس کا دباؤ ہجرت کے بعد ابتدائی دنوں میں زیادہ محسوس ہونا چاہیے تھا اور یہ اسکیم بالکل آغاز ہی میں شروع کر دی جاتی۔ اس کے برعکس معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہجرت کے چند ماہ بعد رائج کیا گیا جبکہ اس وقت تک مہاجرین معاشرہ میں اپنی جگہ بنا چکے تھے یا کم از کم ان کی طرف سے کسی شدید دباؤ کا سامنا نہ تھا۔ لہٰذا ہمارے نزدیک اس کی ضرورت معاشی سے زیادہ معاشرتی استحکام کے نقطہ نظر سے تھی۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی جگہ دوسرے علاقوں سے لوگ آ کر کافی تعداد میں بس جائیں اور وہ وہاں کی سوسائٹی میں' وہاں کے بازاروں میں' وہاں کے کاروبار میں بھرپور حصہ لینے کے قابل ہوں تو جلد یا بدیر پہلے سے رہنے والے لوگوں کے اندر ان کے لیے بیزاری اور نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان جذبات کو بھڑکا کر قدیم اور جدید باشندوں کو آپس میں لڑا دینا اس وقت بہت آسان ہوتا ہے جب کوئی سازشی عناصر بھی اس جگہ موجود ہوں۔ مدینہ میں یہود ماضی میں اوس و خزرج کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں بے حد کامیاب رہے تھے اور ان کے سازشی عناصر سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ آہستہ آہستہ انصاری نوجوانوں کو مہاجرین کے بالمقابل لا کھڑا کریں۔ اس خطرہ کی پیش بندی اسی طرح ہو سکتی تھی کہ قدیم الاسلام مہاجرین کو متفرق قبائل اور مختلف محلوں میں پھیلا دیا جائے تاکہ وہ ایک طرف انصار کے اندر دین کا حقیقی فہم پیدا کریں اور ان کی تربیت کریں اور دوسری طرف اپنے طرز

عمل سے وہ اس بات کو واضح کرتے رہیں کہ وہ انصار کے قدر دان ہیں اور مہاجرین و انصار دونوں ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں اور صرف حق کے علمبردار ہیں۔ ان کی کوئی حقیر دنیاوی اغراض نہیں ہیں جن کے باعث وہ عارضی طور پر یکجا ہوئے ہیں بلکہ یہ دونوں اللہ کے دین کے سپاہی ہیں اور ان کا جینا مرنا ایک ساتھ ہوگا۔ مواخات کی اسکیم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مفاہمت کی فضا قائم کرنے میں بڑی مدد دی۔ بعد میں یہود کے ایجنٹوں نے مختلف مواقع پر انصار کے جذبات کو مہاجرین کے خلاف بھڑکانے کی کوشش بھی کی لیکن ان کی وحدت فکر اور یک جہتی کی اسپرٹ نے ان کی کوئی تدبیر نہ چلنے دی۔ ہر قبیلہ میں ایسے مہاجرین موجود تھے جن کا اثر اس قبیلہ میں محسوس کیا جاتا تھا اور اہل قبیلہ ان کی نصیحت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر وہ فوراً اپنا فرض ادا کرتے اور مہاجر اور انصاری کے فرق کو نمایاں نہ ہونے دیتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نہایت اہم مواقع پر مواخات نے مدنی معاشرہ کو بحران کا شکار ہونے سے بچالیا۔ حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلافت کے قیام کا مرحلہ بھی خوشگوار انداز میں طے ہوگیا اور قریشی خلافت کے خلاف اٹھنے والی آواز دب کر رہ گئی۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے فوراً بعد ہی مواخات کا یہ انتظام نہ کردیا ہوتا تو اسلام دشمن قوتیں علاقائی اور قبائلی تعصبات کو ہوا دے کر امت مسلمہ کی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

میثاق مدینہ

بیعت عقبہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس و خزرج کے وفد پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ یثرب کو ہجرت کے بعد قریش نچلے نہیں بیٹھیں گے بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ اور ان کے حلیف جنگ کی صورت حال پیدا کر دیں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کی ہجرت کے بعد اہل یثرب کو ہر گورے اور کالے سے لڑنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ یہ راستہ دشوار گزار ہوگا۔ اس میں بڑے نقصانات ہو سکتے ہیں۔ جان و مال کی قربانی دینی ہوگی اور شہر کا امن و سکون غارت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اہل یثرب اگر اپنے ہاں ہجرت کی دعوت دیتے ہیں تو انہیں تمام خطرات پیش نظر رکھنے ہوں گے۔ اگر وہ ان سنگین حالات میں بھی اپنا وعدہ ایفا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو وہ میزبانی کی پیشکش کریں ورنہ ابھی حالات کا جائزہ لیں۔ ارکان وفد نے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد اپنی پیشکش پر جب اصرار کیا تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سمع و طاعت کی بیعت لی۔

قریش کو جونہی اوس و خزرج کے وفد کی بیعت کی خبر ملی انہوں نے ایام حج ہی میں ان کو دھمکیاں دیں کہ انہوں نے اپنے اس عمل سے قریش سے مخاصمت مول لے لی ہے اور یہ ان کو مہنگی پڑے گی۔ انہوں نے بیعت کرنے والے ایک معزز شخص کو یثرب جاتے ہوئے گرفتار بھی کر لیا اور انکو مکہ واپس لے آئے تاکہ خوفزدہ کریں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے ملک میں ایک قبیلہ کا کسی کو جوار (پناہ) دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ قبائل جب کسی شخص کو جوار دے دیتے تو وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دیا کرتے۔ اس کو دشمن کے حوالے کرنے کا ان کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قریش کو معلوم تھا کہ اوس و خزرج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں سخت جانی کا مظاہرہ کریں گے اور قریش کے لیے ان قبائل کی دشمنی آگے چل کر خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے باوجود قریشی سرداروں' ابوسفیان اور ابی بن خلف نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کر جانے کے بعد یثرب کے سرداروں کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ کے قبائل کے لیے ہمارے اندر دشمنی پیدا ہو جانا دوسرے تمام قبائل کی نسبت ہمیں زیادہ ناپسند ہے۔ تاہم یہ بات تمہارے لیے بڑے شرم کی ہے کہ تم نے ہمارے ایک معزز فرد کو پناہ دے دی ہے اور تم اس کا دفاع کرنا چاہتے ہو۔ وہ اچھا ہے یا برا' دونوں صورتوں میں ہم اس کے ولی اور اس کو واپس مانگنے کے حق دار ہیں' لہٰذا تم ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔

اس خط کے مضمون میں قریش کی رعونت اور قبائل عرب میں اپنی حیثیت کا احساس پورے طور پر جھلک رہا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے بخیر و عافیت نکل جانے کو اپنی شکست سمجھ رہے ہیں اور جو قبیلہ ان کی پشت پناہی کرے گا اس سے وہ جنگ کرنے سے گریز کرنے والے نہیں ہیں۔ یہی وہ بات تھی جس کا اندیشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے تھا اور بیعت عقبہ کے موقع پر آپ نے بے کم و کاست اس کا اظہار کر دیا تھا۔ ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یثرب اور اس کے نواح کی آبادیوں اور ان کے باشندوں سے خود واقفیت حاصل کی اور وہاں کے زمینی حقائق کی روشنی میں قریش کے خطرہ کے پیش نظر تمام ضروری معاملات اور مختلف لوگوں کی ذمہ داریوں اور حقوق و فرائض کو تحریر میں لانے کا فیصلہ کیا۔ یہ تحریر "میثاق مدینہ" کہلاتی ہے۔ اس کو بعض اہل تحقیق اسلامی حکومت کا چارٹر اور دوسرے اس کا آئین قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ اس حکومت کا آئین اور قانون قرآن مجید کی صورت میں بتدریج نازل ہو رہا تھا۔ اس کا

جتنا حصہ نازل ہو چکا تھا وہ نافذ العمل بھی ہو جاتا۔ اللہ کے رسول موجود تھے اور اہل ایمان ان پر بھرپور اعتماد رکھتے تھے۔ لہذا اس تحریر کا مقصد صرف ذمہ داریوں کا تعین تھا تاکہ ہر قبیلہ اور گروہ پر واضح رہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس کے لیے حدود کار کیا ہیں۔ اس تحریر کا حدود اربعہ بھی محدود تھا۔ اس میں وہی معاملات زیادہ وضاحت سے درج ہوئے جن پر بیعت عقبہ کے موقع پر گفتگو ہو چکی تھی۔ قریش کا خط اس تحریر سے پہلے آیا یا بعد میں' کتب سیرت اس بارہ میں خاموش ہیں لیکن چونکہ اس خط کی توقع پہلے سے تھی اس لیے ہمارے نزدیک میثاق کی تحریر پہلے سے ہو چکی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس خط کی اہمیت ختم ہو گئی اور اس بات کا تذکرہ تک بھی کہیں نہیں ملتا کہ خط کا جواب قریش کو دیا گیا یا نہیں۔

میثاق کے بنیادی امور حسب ذیل ہیں:

1۔ یہ تحریر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بطور پیغمبر صادر ہوئی جس میں اصلاً مہاجرین قریش کے مومنین اور یثرب کے مومنین کے درمیان فرائض کی تقسیم کی گئی۔ لیکن اس میں یہ گنجائش رکھی گئی کہ ان دونوں فریقوں کے ساتھ بعد میں آ ملنے والے' ان کا ساتھ دینے والے اور ان کے ہمراہ جہاد کرنے والے بھی معاہدہ میں شریک ہو سکیں گے۔ گویا مکہ سے بعد میں ہجرت کر کے آنے والوں نیز اہل یثرب میں نئے اسلام قبول کرنے والوں پر بھی اس معاہدہ کا اطلاق مانا گیا۔

2۔ اس تحریر کے ذریعے قریش کے مہاجرین کو پابند کیا گیا کہ وہ دیت اور خون بہا کی ادائیگی اپنے خاندانی رواج کے خود مطابق کریں گے اور اپنے اسیروں کو فدیہ دے کر چھڑائیں گے۔ یہ معاملہ دستور کے مطابق اور اہل ایمان کے ساتھ عدل و انصاف کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے ہوگا۔ اہل یثرب کے تمام بڑے خاندان بنو عوف' بنو حارث' بنو ساعدہ' بنو النجار' بنو عمرو بن عوف' بنوالنبیت' بنو اوس اور بنو جشم بھی اپنے رواج کے مطابق دیت اور خون بہا یا اپنے اسیروں کا فدیہ ادا کرنے کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات کرائی گئی اس کے تحت دیت اور خون بہا جیسے بڑے معاملات شامل نہیں تھے۔ انصار پر اگر یہ ذمہ داری بھی ڈال دی جاتی تو یہ ایک ناروا بوجھ ہوتا جس کو اٹھانے کو تو وہ اٹھا لیتے لیکن بعد میں اس کے باعث دلوں میں کدورت پیدا ہو سکتی تھی اور اسلام کے بد اندیش اس سے فائدہ اٹھا کر کسی مرحلہ پر مہاجرین اور انصار میں پھوٹ ڈال کر ان کو آپس میں لڑا دیتے۔

3۔ اس تحریر کے ذریعے ظلم و زیادتی کی راہ روکی گئی اور قبائلی زندگی کے رواجوں سے بالاتر ہو کر معاہد

پارٹیوں کو اہل ایمان کے تحفظ کا پابند کیا گیا۔ طے کیا گیا کہ کوئی شخص اگر ظلم' زیادتی' گناہ یا فساد پھیلانے کا مرتکب ہوگا تو تمام مسلمانوں کا اجتماعی ہاتھ اس کے خلاف ہوگا۔ کسی مسلمان کا قتل ناحق رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔ تمام اہل ایمان ایک دوسرے کے حمایتی اور امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ وہ کسی کافر کی خاطر کسی مومن کو قتل کریں گے نہ ایسا کرنے میں کافر کو مدد مہیا کریں گے۔ اس طرح کی ہدایات اہل ایمان میں وحدت پیدا کرنے اور شہر میں اندرونی استحکام قائم رکھنے کے لیے تھیں تاکہ کفار شہر میں اپنے آلۂ کار پیدا کر کے اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکیں۔ خود شہر کے متعلق بھی دستاویز میں یہ واضح کیا گیا کہ وادی یثرب کو مامون حرم سمجھا جائے گا' جہاں شرارتی لوگوں کو پنپنے کا موقع نہ دیا جائے گا اور باشندے ایک دوسرے کی مرضی کے خلاف حلف اور جوار کا تعلق قائم کر کے دشمنی کا بیج نہیں بوئیں گے۔ صاف نظر آتا ہے کہ ان ہدایات سے اوس و خزرج کی حریفانہ چشمک کا سدباب مقصود تھا۔

4۔ اس دستاویز میں یہود کی ذمہ داریوں کا تعین بھی کیا گیا۔ ان کو اہل ایمان کے ساتھ کا ایک ایسا گروہ تسلیم کیا گیا جو اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے بھی مشترکہ مفادات کے لیے مسلمانوں کے ساتھ کام کرے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ' جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا' اوس و خزرج کے تمام خاندانوں میں بہت سے لوگ یہودیت قبول کر چکے تھے۔ قبائلی زندگی میں ان کو کاٹ کر پھینکا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ قبیلہ کی ذمہ داریوں میں شریک ہوتے اور قبیلہ ان کا ذمہ دار تھا۔ لہذا دیت' خون بہا اور اسیروں کے فدیہ کی ادائیگی میں یہ بھی قبیلہ کے ساتھ تعاون کرتے۔ ان کے اہل خاندان کی اکثریت اسلام قبول کر کے معاہدہ میں شریک ہو گئی تو یہ لوگ بھی ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ ان کو نہ اسلام لانے پر مجبور کیا جا سکتا تھا نہ ان کو قبائلی تحفظ سے محروم کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ تحریر میں یہ واضح کر دیا گیا کہ بنو عوف' بنو الحارث' بنو ساعدہ' بنو جشم' بنوالنجار' بنو ثعلبہ' بنو الاوس وغیرہ خاندانوں کے یہودی عناصر اپنے قبائل کے ساتھ ہوں گے۔ انہی کی مانند یہ بھی مصارف برداشت کریں گے اور نصرت و تعاون فراہم کریں گے۔ البتہ جنگ میں ساتھ دینے کے لیے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشگی اجازت لینی ہوگی۔ یہود کو یقین دہانی کرائی گئی کہ جب تک وہ اہل ایمان کے تابع رہیں گے ان کی مدد کی جائے گی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا' نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔ یہ معلوم رہے کہ اس ضمن میں بنو عوف' بنو الحارث وغیرہ جو نام آئے ہیں یہ اوس اور خزرج کے ذیلی خاندانوں کے نام ہیں۔ بنی اسرائیل کے یہود قبائل

الگ تھے اور ان کے نام اس تحریر میں نہیں آئے۔

5۔ قریش مکہ کی شرارتوں کے سدباب اور ان کے متوقع حملہ کے مقابلہ کے لیے بھی پالیسی اس دستاویز میں طے کر دی گئی۔ اس کے اہم نکات یہ تھے کہ کوئی شخص قریش کے کسی شخص یا سامان کو پناہ مہیا نہیں کرے گا۔ کسی خاتون کو اس کے اولیا کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔ قریش کے معاونین کو پناہ نہیں دی جائے گی۔ پناہ حاصل کرنے والا کوئی بھی شخص اسی وقت تک مامون ہوگا جب تک وہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور غداری نہیں کرتا۔ یثرب پر حملہ کرنے والے ہر شخص کے خلاف اس معاہدہ میں شامل تمام طبقات معاونت کے پابند ہوں گے۔ جنگ کی صورت میں یہود بھی مصارف جنگ برداشت کریں گے۔ مذہبی جنگ کی صورت میں ہر گروہ کی وفاداری اپنے اہل مذہب کے لیے ہوگی۔ کوئی مسلمان اپنے طور پر صلح کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ صلح اجتماعی ہوگی۔ جب اس کا فیصلہ ہوگا تو ہر شخص اسے قبول کرے گا۔

6۔ اس تحریر کے بارے میں اگر بعد میں کوئی قضیہ پیدا ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹایا جائے گا اور ان کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ گویا قبائل اوران کی ذیلی شاخیں اس تحریر کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ماتحتی میں آگئیں اور ان کے سرداروں کا کردار اس دستاویز میں طے کردہ حدود کے اندر ضمنی رہ گیا' البتہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے داخلی معاملات میں پہلے کی حیثیت کے حامل تھے۔

میثاق مدینہ نے ایک طرف انصار پر مواخات کی ذمہ داریوں کو محدود کیا اور دوسری طرف اہل یثرب اور مہاجرین میں باہمی مفاہمت پیدا کرنے' انہیں ایک مقصد کے لیے مجتمع کرنے اور مربوط معاشرہ قائم کرنے میں مدد دی۔ تیسری جانب قریش کی طرف سے متوقع جنگی کار روائیوں کے مقابلہ کے لیے پہلے سے پالیسی طے کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت آنے پر افراتفری میں کوئی فیصلے نہیں کرنے پڑے بلکہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہر شخص اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

قریش کی جانب سے دھمکی آمیز خط کے بعد جب ان کے علم میں یہ بات آئی ہوگی کہ اہل یثرب مکہ کے مہاجرین کی حمایت میں یک جان ہو چکے ہیں تو ان کی توقعات پر جو اوس پڑی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اب انہیں کوئی اقدام کرنے سے پہلے سو بار سوچنا ضروری ہوگیا تھا کیونکہ یثرب کے باحیثیت قبائل' جن کے روابط اپنے پڑوس کے قبائل کے ساتھ بھی حلیفانہ تھے' ان کے لیے تر لقمہ نہیں بن سکتے تھے۔

میثاق مدینہ کی دستاویز میں زیر بحث آنے والے نکات ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مہاجرین و انصار کے قبائل کے درمیان ذمہ داریوں کے تعین اور قریش کی جانب سے متوقع حالت جنگ کے مقابلہ کے لیے فرائض کی تقسیم کا ایک معاہدہ تھا۔ وقت کے حالات نے ان امور کو ضبط تحریر میں لانا ضروری کر دیا تھا۔ لیکن یہ نکات اتنے جامع و مانع نہیں ہیں کہ ان کو اسلامی ریاست کا دستور و آئین قرار دیا جا سکے۔ دستور اور آئین میں طے کیے جانے والے امور کا تعلق بہت سی مختلف جہات سے ہوتا ہے اور ان میں تمام وظائف حکومت کے بارے میں پالیسی درج کی جاتی ہے۔ ایسے امور قرآن مجید میں طے ہو رہے تھے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بارے میں رہنمائی اگلے کئی سالوں میں وحی کی صورت میں نازل ہوئی۔ لہذا میثاق مدینہ کو ایک وقتی معاہدہ سمجھنا چاہیے اور یہی اس کی اہمیت ہے۔ جن لوگوں نے اس کو اسلامی حکومت کا آئین ثابت کرنے پر محنت صرف کی ہے' ہمارے نزدیک انہوں نے ایک غلط موقف اختیار کیا ہے۔

ایک اور غلط فہمی' جس کا شکار ہمارے سیرت نگار ہوئے ہیں' یہ ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل یعنی قبائل بنی نضیر' بنی قریظہ اور بنی قینقاع کو بھی از خود اس معاہدہ میں شامل سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک یہ گروہ اسلامی حکومت کے تحت ایک امت کے اندر شامل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فوقیت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ معاہدہ جن پارٹیوں کے مابین ہے وہ مومنین قریش اور مومنین یثرب ہیں' جن کے لواحقین و اتباع بھی اس میں شامل ہیں۔ جب معاہدہ کے سرنامہ میں فریقین معاہدہ کا ذکر کر دیا گیا تو آگے جہاں لفظ یہود آئے گا تو اس کا مصداق ہر یہودی قبیلہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہی یہودی مراد ہوں گے جو کسی فریق کے لواحقین و اتباع میں شمار کیے جا سکتے ہوں۔ چنانچہ دستاویز میں آگے چل کر قبیلوں کے ان بطون کا نام بھی لے لیا گیا جن کے یہود کے حقوق و فرائض یہاں بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں قبائل بنی اسرائیل کا نام شامل نہیں اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ بیعت عقبہ اوس و خزرج کے ساتھ ہوئی تھی نہ کہ بنی اسرائیل کے ساتھ' اور قریش کی دشمنی بھی اوس و خزرج کے ساتھ تھی نہ کہ یہودی قبائل کے ساتھ' جن کی وفاداریاں مشرکین قریش کے ساتھ تھیں۔

جہاں تک ان اسرائیلی قبائل کے ساتھ معاہدات کا تعلق ہے تو وہ بھی ایک حقیقت ہیں۔ انہی کی خلاف ورزیوں کے نتائج ان کو وقتاً فوقتاً بھگتنے پڑے۔ لیکن ان کے معاہدات میثاق مدینہ میں شامل نہیں۔ ان کا الگ سے سراغ لگانا ہوگا کیونکہ سیرت کی ابتدائی کتابوں میں ان معاہدات کا حوالہ ملتا ہے۔

یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بنو قینقاع کو جب معاہدہ کی شرائط پورا نہ کرنے پر جلا وطن کیا گیا تو دوسرے اسرائیلی قبائل نے اپنے معاہدوں کی پھر سے تجدید کی۔

ہمارے اہل تحقیق نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ میثاق مدینہ کے تحت مسلمان، یہود اور مشرکین جو بھی وادی یثرب میں آباد تھے وہ ایک امت قرار دیے گئے اور ان کو مذہبی تحفظ فراہم کیا گیا۔ (مثلاً دیکھئے رسول اکرم کی سیاست خارجہ از پروفیسر محمد صدیق قریشی) وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کار رسالت ابھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا اور آپ لوگوں کے غلط ادیان کو تحفظ مہیا کرنے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ یہ غلط فہمی اس صورت میں رفع ہو جاتی ہے جب یہ مانا جائے کہ میثاق مدینہ کوئی ابدی دستاویز نہیں تھی بلکہ ذمہ داریوں کا وقتی تعین تھا۔ معاہدہ میں شامل یہود و مشرکین کو اسلام کی دعوت دینے میں کوئی چیز مانع تھی اور نہ ان کے اسلام قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ تھی۔ یوں بھی تمام انسانوں سے جو مطالبہ تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا تھا۔ لیکن یہ کام بلا جبر و اکراہ ہونا مقصود تھا، جب تک کہ لوگوں پر اتمام حجت نہ ہو جاتا۔ لہٰذا ہجرت کے فوراً بعد نئے ماحول میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ لوگ فی الفور اسلام لے آئیں گے۔ ان کو سوچنے سمجھنے کا وقت دیا گیا اور کئی سال بعد وہ مرحلہ آیا جب مشرکین سے اسلام لانے اور یہود سے اسلام یا جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے میثاق کو دو حصوں پر مشتمل دستاویز گردانا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں یہود کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی اقتدار تسلیم کر لینا قرین قیاس نہیں۔ لہٰذا وہ یہ مانتے ہیں کہ غزوہ بدر میں قریش کی شکست کے بعد یہود خوفزدہ ہو گئے تو انہوں نے بھی معاہدہ میں شمولیت اختیار کر لی اور اس کے لیے میثاق کا وہ دوسرا حصہ تحریر ہوا جس میں یہود کا حوالہ ہے (دیکھئے عہد نبوی میں نظام حکمرانی 1 - ص 76) ڈاکٹر صاحب کا یہ قیاس اس صورت میں شائد قابل فہم ہوتا اگر یہود کے خاندانوں کے نام معاہدہ میں نہ دیے گئے ہوتے۔ جیسا کہ اوپر بتلایا گیا یہ تمام نام اوس اور خزرج کے بطون کے ہیں اور ان عرب قبائل کے یہود پہلے روز ہی سے شریک معاہدہ تھے۔ اس لیے کہ یہ معاہدہ اوس و خزرج کے ساتھ تھا۔ لہٰذا ان کے معاملہ کو غزوہ بدر کے نتائج تک موخر کرنے کی کوئی بنیاد نہ تھی۔

تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ

نمبر	کتاب	روپے	پیسے
1	مجموعہ تفاسیر فراہی	264	00
2	حکمت قرآن	75	00

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

نمبر	کتاب	روپے	پیسے
1	تدبر قرآن: (9 جلد)	2376	00
	(فی جلد):	264	00
2	مبادی تدبر قرآن	87	00
3	مبادی تدبر حدیث	72	00
4	حقیقت شرک و توحید	105	00
5	حقیقت نماز	45	00
6	حقیقت تقویٰ	45	00
7	تزکیہ نفس : جلد دوم	87	00
8	دعوت دین اور اس کا طریق کار	90	00
9	اسلامی قانون کی تدوین	60	00
10	اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	60	00
11	اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	87	00
12	قرآن میں پردے کے احکام	10	00
13	فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں	90	00
14	تفہیم دین	72	00
15	مقالات اصلاحی: جلد اول	114	00

فاران فاؤنڈیشن

122 - فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور – 54600 - پاکستان
فون – 7595200